www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2024 ، قیمت :- 15 ₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

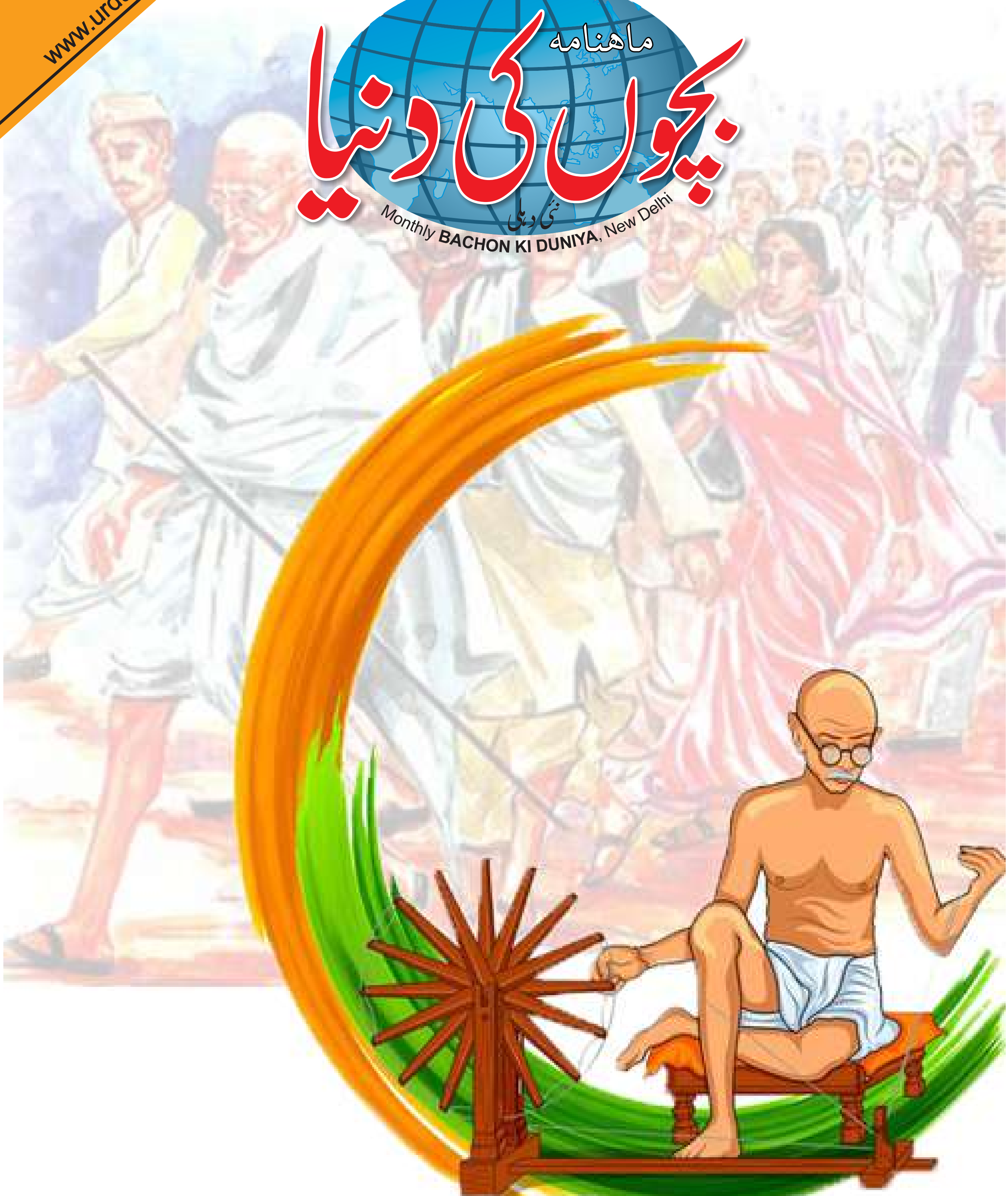

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 25 روپے، سالانہ: 240 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

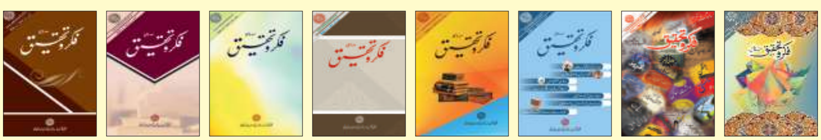

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 12 شمارہ: 10 اکتوبر 2024

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم ـ محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: 15/ روپے، سالانہ/145 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی - 110066
فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد - 500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

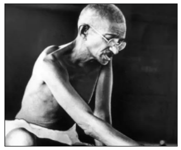

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا	حافظ کرناٹکی	07
نابیناؤں کا عالمی دن یعنی سفید چھڑی کا دن	انصار احمد معروفی	09
نئی تعلیم	محمد قمر سلیم	14
باپو نے کہا	رضوانہ سید	18
نظمیں		
باپو جینتی آؤ منائیں	کوثر صدیقی	22
اردو زباں ہماری	ارشاد احمد ارشاد	23
میٹھی زبان اردو	جاوید رانا	24
پنکھا	رخشاں ہاشمی	25
ترانۂ سائنس	منور دانا پوری	26
ہم بچے	ثناء اللہ دوگھروی	27
کہانیاں		
تدبیر	مشتاق کریمی	28
بچوں کی دنیا	اقبال برکی	31
ہماری زمین	شاہ تاج	34
میلہ	محمد گلزار عالم	39
سارس کی احسان مندی	حمیرا عالیہ	42
ماشا کا بستر	گیلینا للیبی دیوا، مترجم: محمد اسد اللہ	45
قسط وار ناول		
جنگل کی کہانی رمیش نارائن تیواری	مترجمہ : زینت شہریار	48
سائنس		
چاند کے داغوں میں انسانی رہائش کے امکانات	ادریس شاہجہانپوری	51
صحت اطفال		
منکی پاکس	نسیم سعید	53
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		57
واقفیت عامہ		
تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات		58
ننھے فنکار		
اچھے خیالات	سمیہ کوثر	59
پینٹنگ		61

پیارے بچو! دنیا میں صحت سے بڑھ کر کوئی نعمت اور دولت نہیں ہے، صحت ہے تو سب کچھ ہے، دنیا کی ساری خوشی اور ساری آسائشیں اسی کے دم سے ہیں، ایک صحت مند انسان ہی ایک اچھی اور کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہے، پڑھائی، کھیل کود اور دیگر کاموں میں سرخروئی حاصل کرسکتا ہے، تندرست انسان ہی گھریلو اور سماجی ذمے داری اٹھاسکتا ہے، اس لیے اچھی صحت کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور ہر وہ چیز جس سے صحت متاثر ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیے، اچھی صحت کے لیے صحت مند اور صاف ستھری غذا کا استعمال نہایت ضروری ہے، باہر کے کھانے سے حتی الامکان بچنا چاہیے، باہر کا کھانا صحت کے لیے بے حد نقصاندہ ہے اور اس سے ہاضمہ بھی خراب ہوتا ہے، فاسٹ فوڈ اور جنک فوڈ بظاہر تو اچھے لگتے ہیں، لیکن اس سے صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے، اگر اچھی صحت چاہیے تو ان چیزوں کو بالکل بھی ہاتھ نہ لگائیں، گھر، آفس، اسکول اور ہر جگہ گھر کے بنے ہوئے کھانے کو ہی ترجیح دیں تاکہ آپ کی صحت اچھی رہے اور آپ چاق وچوبند رہیں۔

بچو! صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے، اس لیے صحت سے کوئی بھی سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے، الیکٹرانک آلات کی وجہ سے ہمارے روزمرہ کے معمولات متاثر ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، ضرورت کے وقت ہی موبائل، لیپ ٹاپ یا دیگر چیزوں کا استعمال کریں، رات میں جلدی سونے کی کوشش کریں تاکہ صبح کو آپ جلدی بیدار ہوسکیں، جب نیند پوری نہیں ہوگی تو پھر آپ تازہ دم نہیں رہیں گے، صبح اٹھ کر ہلکی پھلکی کسرت کو اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کریں، شام کے وقت دوستوں کے ساتھ میدان میں کوئی کھیل ضرور کھیلیں اس سے آپ فٹ رہیں گے اور پھر پڑھائی کے وقت آپ سستی محسوس نہیں کریں گے، ابھی آپ چھوٹے ہیں اچھی اور بری چیزوں سے واقف نہیں ہیں اس لیے اپنے والدین اور بڑوں کی باتوں پر عمل کریں اور وہ جن چیزوں کے کھانے یا کرنے سے روکیں تو بغیر کسی حجت اور بحث کے ان کی بات کو مانیں اس لیے کہ وہ آپ کی بہتری اور آپ کی صحت کو لے کر فکر مند ہیں اسی لیے وہ آپ کو غلط چیزوں کے کرنے سے روکتے ہیں اور نقصان دینے والی چیزوں کے استعمال پر ٹوکتے ہیں۔

پیارے بچو! یہ اکیسویں صدی ہے اور اس صدی میں جس تیز رفتاری سے ترقی ہو رہی ہے اور ہر میدان میں نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں وہ واقعی خوش کن ہے لیکن اسی کے ساتھ نئی نئی بیماریاں بھی ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہیں، جب تک ہم صحت مند نہیں رہیں گے تو بیماریوں کا کیسے مقابلہ کر پائیں گے، اس لیے اپنی صحت کا اور اپنے آس پاس صاف صفائی کا خاص خیال رکھیں، گلی محلے کی صفائی میں اپنے بڑوں کی مدد کریں، آپ ملک وقوم کا مستقبل ہیں، آپ صحت مند رہیں گے جبھی ہمارا ملک صحت مند رہے گا۔

آپ کا

شمس اقبال

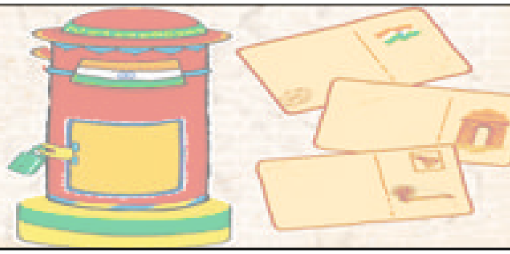

ڈاک خانہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ اس رسالے میں میری تخلیق 'برسات' دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا جس کے لیے میں آپ کی مشکور ہوں۔ سرورق ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی تصویر کے ساتھ پیارے بچے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ مدیر ڈاکٹر شمس اقبال کا اداریہ پڑھا جس میں تعلیم اور اساتذہ کی اہمیت کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں عمدہ مضامین، پیاری نظمیں اور دلچسپ کہانیاں ہیں، خاص کر مجھے پرویز مانوس کا 'کانگڑی کا راز' بہت پسند آیا۔ مزاحیہ کہانیاں بھی دلچسپ ہیں اور صحت اطفال میں محمد خلیل صاحب نے 'پپیتا' کے متعلق بہت سی جانکاریاں اور فوائد بیان کیے ہیں۔ تاریخی سائنسی اور ثقافتی معلومات بچوں کے لیے بے حد مفید ہیں اور آخر میں ننھے فنکاروں کی رنگین اور دلکش تصاویر بے حد پسند آئیں۔

شمس النسا کرن، ہندوپور، آندھرا پردیش

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اگست 2024 کا تازہ شمارہ بک اسٹال رشید بک ڈپو منڈی بازار، برہانپور سے خریدا، پندرہ اگست کی خوشی اور بچوں سے سجا سرورق پسند آیا۔ ہم آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اگست کے شمارے میں ہمارا مضمون بعنوان 'پتھر چٹا' ننھے فنکار میں شائع کر کے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ ہمارے چھوٹے بھائی بہن کی پینٹنگ کے لیے بھی بہت شکریہ! ہم بچوں کی دنیا ہر ماہ ذوق و شوق سے بلا ناغہ پڑھتے اور چھوٹے بھائی بہن کو سناتے ہیں۔ اس رسالے میں ہر ماہ سبق آموز، کہانیاں؛ نظمیں، مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں پڑھ کر اچھا لگتا ہے معلومات بھی ملتی ہیں۔ اداریہ پسند آیا۔ پہلا مضمون 'سمندر اور اس کی اہمیت' سمندر کی اہمیت اور دنیا کے سب سے بڑے سمندر کی معلومات ملی شعر بھی پسند آئے۔ 'فیوچر لائبریری پروجیکٹ' دلچسپ ہے۔ جشن آزادی، قومی پرچم سے ترانہ یوم آزادی تک یوم آزادی کی اہمیت ہر شاندار نظم ہے۔ 'آزادی کی کہانی' اچھے انداز میں لکھی ہے پڑھ کر اچھا لگا۔ بھی عمدہ ہیں۔ 'گھڑا' جسے محمد مستمر نے لکھا ہے گھڑے کی داستان اور اس کی قدر و قیمت کا دل میں احساس پیدا کیا۔ 'ناورو : ایک چھوٹا اور موٹا ملک' یہ ہندوستان کے سب سے کم آبادی والے شہر سے بھی کم ہے۔

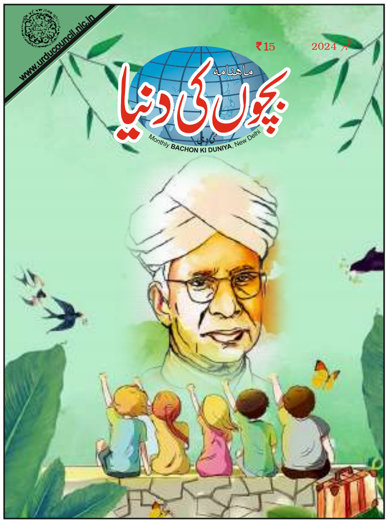

ضلع پریشد اردو اسکول پیپل گاؤں، کالے، جلگاؤں، جامود، ضلع بلڈھانہ، مہاراشٹر

'گدھے کی حجامت' مزاحیہ کہانی بھی اچھی لگی۔ 'غصہ' واقعی خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔ 'وفادار ساتھی' سچ میں چہروں کی خوبصورتی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے جب تک دل صاف نہ ہو۔ تیرتھ، چاند کا سفر، ہکلاہٹ لکنت اور بچے وغیرہ مضامین بھی بے حد اچھے ہیں۔ 'قسط وار ناول' بلا ناغہ پڑھتے ہیں۔

ثمینہ بانو محمد افضال، خانقاہ وارڈ، برہانپوری، مدھیہ پردیش، ایم

جولائی 'بچوں کی دنیا' بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ نظمیں: بچوں کی دنیا، خواب دیکھا کرو، میں ہوں غریب لڑکی تینوں بہت بہترین تھیں۔ اس کے مشمولات بہت ہی بہترین اور متنوع ہیں۔ کہانیاں بھی بے حد دلچسپ اور شاندار تھیں۔ سلسلے وار کہانی بھی بہت اچھی ہے۔ واقفیت عامہ میں 'تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات اور 'ریڈیم کی کہانی' بہت ہی معلومات افزا اور قیمتی ثابت ہوئیں، اللہ رسالے کو اسی طرح بقا اور ترقی عطا فرمائے۔

عظیم اقبال

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اداریہ میں کہا گیا ہے کہ تعلیم انسان کے لیے بے حد ضروری ہے، آپ نے لکھا ہے کہ بغیر محنت کے اچھی تعلیم ممکن نہیں ہے۔ سیر و تفریح بھی بچوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سو فیصدی سچ ہے۔ اے پی جے عبدالکلام بابائے میزائل بھی اچھا مضمون ہے۔ طالب علم کی ایک اہم خصوصیت سوال کرنا ہے۔ طلبا کو سوالات کرنے دیں۔ متین الدین کی 'پتوں کی گفتگو' اچھی لگی۔ نوبل انعام یافتہ کیلاش ستیارتھی بھی معلوماتی مضمون ہے۔ نظم موٹو جی اور مضمون ہمالیہ کی سیر بھی پسند آیا۔ گنگا کب میلی ہوگئی پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے وہ لہجہ پسند آیا۔ محمد عثمان دادا ایک محنت کش ثابت ہوئے۔ کہانی محنت کی کمائی میں فراز کے والد آٹو ڈرائیو رتھے اور اپنی محنت سے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ انوکھا چوکیدار، جنگل کی کہانی اور ریڈیم کی کہانی بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

عبدالمجید مکرو، اروانی، اننت ناگ، کشمیر

مضمون

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا

حافظ کرناٹکی

دنیا میں کروڑوں لوگ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، کچھ لوگوں کی موت کا غم ساری دنیا کو ہوتا ہے تو کچھ لوگوں کی موت کا احساس کسی کو بھی نہیں ہوتا ہے۔ حالانکہ زندگی ایک بڑی ہی قیمتی اور انمول چیز ہے۔ زندگی نام ہی ہے روشنی کا، حرارت کا، کام کا، جوشِ عمل کا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی جو زندہ ہو وہ مر جائے تو اس کی کمی کا کسی کو احساس نہ ہو؟ ہاں یہ ممکن ہے، عموماً انسان دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو دوسروں کے سہارے جیتے ہیں اور دوسرے وہ جو دوسروں کا سہارا بنتے ہیں۔ ایک انسان اپنی ذات سے روشنی کا مینار ہوتا ہے، تو بہت سارے انسان عقل وفہم اور آنکھ رکھ کر بھی اندھے ہوتے ہیں وہ دوسروں کی روشنی میں زندگی کا سفر کرتے ہیں جب کہ دونوں انسان ہی ہوتے ہیں۔

آپ نے اکثر سماج میں دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ فلموں کے عاشق ہوتے ہیں تو کچھ کھیل کے، کچھ لوگ شاعروں اور فنکاروں کے پرستار ہوتے ہیں تو کچھ لوگ سائنسی ایجادات اور سائنس دانوں کے۔ ظاہر ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو برا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ ایسے ہی لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مگر ذرا غور کیجیے کہ زیادہ اہم آدمی فلم کا ایکٹر ہے۔ یا وہ جو فلم ایکٹر پر جان دیتا ہے، زیادہ اہم اور بڑا آدمی، شاعر وادیب یا کسی کھیل کا کھلاڑی ہے، یا وہ جوان لوگوں پر اپنی جان لٹا دینے کی بات کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زیادہ بڑا آدمی وہی ہے جو بھیڑ میں اپنا راستہ آپ بناتا ہے۔ اور پھر اس پر چل کر اپنی

منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ جب وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے تو پھر لوگ خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔

تاریکی کی بہ نسبت روشنی پر جان دینا بذات خود ایک محترم فعل ہے۔ مگر یہ اتنا محترم نہیں جتنا محترم خود کو روشنی میں بدل لینا ہے، یہ اچھی بات ہے کہ ہم کسی نیک انسان کی طرفداری کرتے ہیں مگر یہ اس سے بھی اچھی بات ہے کہ ہم خود نیک بن جائیں۔

آپ میں سے تقریباً تمام لوگوں کو کسی نہ کسی انعامی تقریب یا جلسے جلوس میں شامل ہونے کا موقع ضرور ملا ہوگا اور اکثر آپ نے دوسروں کے بہترین کام پر تالیاں بھی بجائی ہوں گی اور داد کے نعرے بھی بلند کیے ہوں گے۔ کیا ٹھیک اس وقت آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ کاش میں بھی کوئی ایسا نمایاں کام کرتا، یا یہ کہ ان شاء اللہ میں بھی کوئی ایسا کام ضرور کروں گا کہ سارے لوگ میرے لیے تالیاں بجائیں۔ اگر ہمارے اندر اس طرح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اگر ہمارے اندر رشک کا مادہ جوش مارتا ہے تو یقیناً یہ ایک اہم جذبہ ہے، اس کی قدر ضرور کی جانی چاہیے کہ یہی وہ جذبہ ہے جو بجھے ہوئے انسان کو روشن کردیتا ہے۔ اس کے اندر جوش عمل کی چنگاری سلگا دیتا ہے۔ اس کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کردیتا ہے اور وہ دوسروں پر تکیہ کرنے کے بجائے دوسروں کا تکیہ بننے کے قابل بن جاتا ہے۔

بھیڑ بھری سڑک پر جب کسی اندھے کو ہاتھ پکڑ کر کوئی آدمی سڑک پار کرادیتا ہے تو ہم اس کی تعریف کرتے ہیں، خود اندھا آدمی دل سے اس کا ممنون ہوتا ہے۔ دراصل اسی کا نام زندگی ہے۔ لیکن اگر اندھا اپنے اندھے پن پر قانع ہوتا ہے، اور سوچتا ہے کہ چلو اندھے ہوئے تو کیا ہوا یہاں ہاتھ پکڑ کر چلانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے، تو یہ زندگی سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ بالکل یہی بات کھلاڑیوں پر مرنے والے، شاعر و ادیب کے لیے جان لٹانے والوں پر لاگو ہوتی ہیں۔

اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ جن کی محنت، علمیت، قابلیت، قربانی اور ایثار ہماری زندگی کو راحت افزا بناتی ہے۔ ان کے متعلق ممنونیت کا اظہار بہترین عمل ہے۔ مگر اس سے بھی بہتر چیز یہ ہے کہ ہم ان کے شریک کار بن جائیں۔ یعنی محض روشنی پر جان دینے کی حد تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ سراپا روشنی بننے کی کوشش کریں۔ محض اپنی جگہ بیٹھے سر دُھننے سے کچھ نہیں ہونے والا ہے کہ زندگی نام ہی ہے روشنی کا، جرأت کا، حرکت کا، جہد مسلسل کا اور عملِ پیہم کا۔ یہی فرق ہے ایک معمولی پتنگے اور جگنو میں۔ کچھ ایسی ہی حالت مکھی کی ہے، ایک مکھی وہ ہے جو گندگی پر بیٹھتی ہے اور گندگی پھیلاتی ہے، جب کہ ایک مکھی وہ بھی ہوتی ہے جو پھولوں پر بیٹھتی ہے اور اس کا رس چوس کر انسانوں کو شہد فراہم کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں مکھی ہی ہے، لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

■

Hafiz Karnataki
Darul Hafiz, Jai Nagar
Shikaripur
Distt.: Shemoga - 577427 (Karnataka)

مضمون

نابیناؤں کا عالمی دن یعنی سفید چھڑی کا دن

انصار احمد معروفی

15 اکتوبر کو دنیا میں نابیناؤں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔اسے سفید چھڑی کا دن بھی کہا جاتا ہے۔اس دن کو منانے کا مقصد معاشرے کو بصارت سے محروم افراد کے مسائل اور مشکلات کا احساس دلانا ہے۔تاکہ ان لوگوں کی تعلیم وتربیت روزگار اوران کے تحفظ کا مناسب انتظام کیا جاسکے۔یہ دن نابیناؤں کی انٹرنیشنل فیڈریشن کے تحت ہر سال منایا جاتا ہے۔

معاشرے میں کچھ ایسے ملیں گے جن کی ایک آنکھ کی روشنی کسی وجہ سے ختم ہوگئی ہے، جب کہ کچھ ایسے لوگ نظر آسکتے ہیں جن کی آنکھوں میں دیکھنے کی بالکل طاقت نہیں، ان میں ذرا بھی روشنی نہیں، یعنی وہ بالکل اندھے ہیں، جن کے لیے رات دن برابر ہیں، ایسے لوگ معذور ہیں، قابل رحم ہیں، ان کی جہاں تک ہوسکے مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔کئی دہائی پہلے جب ماحول میں چیچک کا زور تھا، اور پورے ملک میں یہ مرض ایک وبا کی صورت پھیل رہا تھا، اس وقت نہ جانے کتنے لوگ اس مرض کی وجہ سے آنکھوں کے عیب میں مبتلا ہوگئے، کوئی کانا ہوگیا، تو کوئی اندھا ہوگیا۔ان لوگوں کے منہ پر اب بھی چیچک کے بڑے بڑے داغ دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن جب حکومت نے اس کا ٹیکہ تیار کرلیا اور تمام لوگوں کو اسے لگوایا گیا، تب سے دھیرے دھیرے اس وبا کا زور کم ہوا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد وہ بڑی والی چیچک ختم ہوگئی اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اللہ نے اس وبا سے ہمیں بچالیا۔

نابیناؤں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی ماں کے پیٹ سے نابینا پیدا ہوئے اور کچھ ایسے ہیں جن کی آنکھ کی

روشنی کسی حادثے یا بیماری کے باعث چلی گئی۔ نابینا ہر زمانے میں رہے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور طبی اعتبار سے ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالی نے انھیں ان کے دور کے مناسب و مطابق معجزہ عطا فرمایا، یعنی وہ لوگ جو مادرزاد اندھے ہوتے، جس کا کوئی علاج کسی حکیم کے پاس نہیں تھا، مگر اللہ کے حکم سے حضرت عیسیٰ اسے اچھا کر دیتے اور وہ بینا یعنی اپنی آنکھ سے دیکھنے والا ہو جاتا۔ جس پر سارے اطبا حیران رہ جاتے۔ یہی ان کا معجزہ تھا۔ معجزہ اس کو کہا جاتا ہے جسے دوسرا کوئی انجام نہ دے سکے اور سب لوگ اس کے کرنے سے عاجز ہو جائیں۔

نابینا ہو جانا یا آنکھ کی روشنی کا اچانک یا رفتہ رفتہ چلا جانا اس وقت بیماری کے طور پر پھیل رہا ہے۔ ٹاوروں سے نکلنے والی شعاعیں، کمپیوٹر اور موبائل کی چکا چوند کرنے والی کرنیں آنکھوں کے لیے بے حد نقصان دہ ہیں۔ بی بی سی اردو کی ایک رپورٹ جو 2017 کی ہے۔ 'لانسٹ گلوبل ہیلتھ' میں چھپی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے اگر بہتر امداد کے ذریعے دنیا کے لوگوں کے بینائی کے مسائل کا علاج نہ ہو سکا تو سنہ 2050 تک دنیا میں اندھے پن کے شکار افراد کی تعداد تین کروڑ ساٹھ لاکھ سے بڑھ کر ایک ارب پندرہ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ جنوبی ایشیا اور نیم صحرائی افریقہ میں اندھے پن اور نظر کی کمزوری کے شکار افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ ماہرین نے پیش گوئی کی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں نابینا افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ دنیا کے 188 ممالک سے موصول ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق دو ارب سے زیادہ آبادی شدید نوعیت کے امراض چشم کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سائٹ سیورز نامی امدادی ادارہ جو دنیا کے تیس ممالک میں کام کرتا ہے، کے مطابق آنکھ کے عدسے کے متاثر ہونے یعنی آنکھ میں موتیا آ جانے کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ غریب ممالک میں بڑھے گا۔ جنوبی ایشیا میں ایک کروڑ سترہ لاکھ افراد آنکھوں کے مرض کا شکار ہیں، جب کہ مشرقی ایشیا میں یہ تعداد ساٹھ لاکھ بیس ہزار ہے۔ بی بی سی اردو نیوز۔

ہندوستان میں صحت سے متعلق بہت سے مسائل ہیں، ان میں سے نگاہ کی کمزوری اور نابینا افراد کا مسئلہ بھی باعث تشویش ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں 'یور اسٹوری' کی ایک رپورٹ؛ جو 2016 کی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ ''کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے ہر تین میں سے ایک نابینا شخص ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے؟ یہ افسوس ناک اعداد و شمار ہیں جو کافی تشویش ناک ہیں، اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں آج 15 ملین لوگ ضعف بصارت اور 52 ملین لوگ آنکھوں کی بیماری سے متاثر ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان میں سے بھی 80 فی صد وہ لوگ ہیں جو وقت پر علاج نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کی بیماریوں کی زد میں آ جاتے ہیں، سب سے زیادہ غریب لوگ آنکھوں کی بیماریوں میں مبتلا ہیں، کیونکہ ان کے پاس علاج کروانے کے لیے پیسہ نہیں ہوتا۔ احمد آباد میں کچھ دوستوں نے جو کہ الگ الگ کالج سے تھے، انھوں نے سوچا کیوں نہ وہ نابینا افراد کی صلاحیت کا صحیح استعمال کر کے انھیں کوئی روزگار دیں، اس کے بعد ڈیزائننگ ٹیم نے ایک منفرد قسم کے آرٹ پر کام کرنا شروع کیا، ہر جوہر

کی الگ مہک ہوتی ہے، انھوں نے جواہرات کی مہک کے بارے میں نابینا افراد کو سمجھانا شروع کیا اور ٹریننگ دی، اس کے بعد ان زیورات پر قدرتی نیچرل اروما کا استعمال کیا گیا تا کہ زیورات زیادہ پرکشش لگیں، بہت جلد ہی سب اس کام میں ماہر ہوگئے، اتنا کہ اب وہ چھوکر ہی نگینے کے بارے میں جان لیتے، یہ پیغام (معاشرے میں) دینے کی کوشش کی ہے کہ ہنر صرف بینائی کا محتاج نہیں ’میڈ ان ڈارک‘ کئی نابینا افراد کے لیے بنے اداروں کے ساتھ پارٹنر شپ کر چکا ہے۔‘‘

نابینا افراد میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو روزی روٹی کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں، جو اپنے ساتھ کسی آنکھ والے کی مدد سے بھیک مانگنے نکل جاتے ہیں اور لوگ ان کی مجبوری سمجھ کر ان کی جھولی میں پیسے ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان میں معذور اور نابینا افراد کو بھیک مانگنے سے بچانے کے لیے ایسے بہت سے روزگار کھولے گئے ہیں جس میں شامل ہو کر وہ کمائی کر سکتے ہیں، سرکاری طور پر بھی حکومت نے نابیناؤں کے لیے بہت سی سہولتیں اور امداد مہیا کی ہے۔

وزیر خزانہ نرملا سیتا رمن نے جمعے کو پارلیمنٹ میں بجٹ کی تقریر میں کہا کہ ایک روپے، دو روپے، پانچ روپے، دس روپے اور بیس روپے کے سکوں کی ایک نئی سیریز جاری کی گئی ہے، ان سکوں کو نابینا افراد بھی آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت نے لکھا ہے کہ ’’انیس سو تیس میں فرانس کے شہر پیرس میں عام لاٹھیوں کو سفید رنگ دے کر اس دن کو متعارف کرانے کی روایت ڈالی گئی تھی، اور پندرہ اکتوبر انیس سو پینسٹھ سے عالمی علامتی دن کے طور پر اسے اقوام متحدہ کے چارٹر میں باضابطہ طور پر شامل کیا گیا تھا۔ سفید چھڑی کا عالمی دن منانے کا مقصد نابینا افراد کو درپیش مسائل اور مشکلات کے متعلق معاشرے کو آگاہی فراہم کرنا اور دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ معذور افراد بھی تھوڑی سی توجہ کے ساتھ ایک ذمے دار اور مفید شہری

ثابت ہوسکتے ہیں۔ سفید چھڑی تو نابینا افراد کو چلنے پھرنے میں تحفظ فراہم کرتی ہے۔ تاہم سفر زیست کے لیے تعلیم، روزگار، صحت اور آبادی میں اضافہ توجہ طلب مسائل ہیں۔

دنیا بھر کے نابینا افراد کو ماہ اکتوبر کے اس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے، جب کہ اس دن منعقد ہونے والے پروگرام نابینا افراد کے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوتے ہیں۔

معذوروں کے کئی مسائل ہیں جن میں ایک اہم مسئلہ ان کی شادی کا ہے، کوئی عام انسان کسی معذور سے شادی کرے، ایسا کم ہی ہوتا ہے، دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اکثر دو معذور ہی آپس میں شادی کا رشتہ قائم کرتے ہیں، مگر ایسا بھی کم ہی ہوتا ہے، کیونکہ معذور لوگوں کی شادی کو ان کے گھر والے کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور ان کی شادی کرنے کو اپنے لیے اضافی بوجھ محسوس کرتے ہیں، وراثت میں تقسیم کے خوف سے معذور افراد کے بھائی بہن بھی ان کی شادی کے خلاف ہوا کرتے ہیں، وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ تو خود ہی اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، دوسرے کا کیا حق ادا کر سکے گا؟ لیکن دل میں ان کے چور چھپا ہوتا ہے کہ یہ ہماری جائداد میں حصے دار نہ ہو جائے۔ اس طرح وہ اکثر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور ان کے حق پر قبضہ جما لیا جاتا ہے، معذوروں کی شادی کی طرف توجہ دلانے کے لیے (ہندوستان میں) کئی ریاستوں میں ایک سرکاری اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت مالی امداد دی جارہی ہے۔

یوں تو معذوروں کا الگ سے ایک دن عالمی طور پر منایا جاتا ہے لیکن نابیناؤں کے لیے ایک دن مخصوص کر کے منانا ان کے مسائل اور مشکلات کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ نابینا حضرات سماج کی توجہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ اندھوں کے جو مسائل اور مشکلات ہیں، وہ اپنی گزر بسر کیسے کرتے ہیں؟ کیا بھیک مانگنے کو ان میں سے غیرت مند لوگ پسند کرتے ہیں؟ یا اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کوئی چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں؟ انھیں معاشرہ کس نظر سے دیکھتا ہے؟

نابینا افراد کی زندگی کا مطالعہ آج کے ترقی یافتہ دور میں کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نابینا حضرات نے شوق علم میں نہ صرف یہ کہ خود کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، بلکہ دوسرے نابیناؤں کو بھی علم کی روشنی سے منور کیا، یوٹیوب اور انٹرنیٹ کے ذریعے بھی انھوں نے دوسروں تک علم کی روشنی پہنچائی، نابیناؤں کے اسکول میں داخلہ لیا، کرکٹ کے شوق نے انھیں ماہر کھلاڑی بنا دیا، وہ عالمی کرکٹ کے لیے بطور کھلاڑی منتخب ہوئے اور اپنی کارکردگی سے دنیا کو متاثر کیا۔ نئی نئی ٹیکنالوجی سے متعارف ہو کر اپنے جیسے ساتھیوں کو بھی اس روشنی سے متعارف کرایا۔ اس میں سے کتنے نابینا گلوکاری میں ماہر ہو گئے، اپنی آواز کے جادو اور گلوکاری سے انھوں نے سامعین کو واہ واہ کرنے پر مجبور کر دیا، اور ایک اپنی مادری زبان ہی نہیں بلکہ چار چار زبانوں میں گائیکی میں مہارت کا جلوہ دکھا کر مبہوت کر دیا۔

اندھے لوگوں کی مدد کرنا، ان کی صحیح راہبری کرنا اور انھیں ان کے مقصد تک پہنچا دینا بہت بڑی نیکی ہے، سامنے اگر کوئی اندھا جا رہا ہو، جسے راستے میں پیش آنے والے خطرات؛ جیسے کنواں، ٹھوکر وغیرہ، تو بینا حضرات

کے لیے اس کی مدد کرنا واجب ہے، بلکہ اگر کوئی شخص نماز وغیرہ جیسے عمل میں بھی مشغول ہو تو اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ نابینا کی مدد کرے، چاہے اس کے لیے نماز کو توڑنا پڑے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اسے جان بوجھ کر کنویں میں گرنے دیا تو گنہگار ہوگا۔

نابینا لوگوں میں اللہ تعالی نے بہت خصوصیت رکھی ہے، ان کی دماغی صلاحیت بہت زیادہ ہوا کرتی ہے، تاریخی کتابوں میں نابینا حضرات کی علم سے محبت، درس و تدریس، بلکہ تصنیف وتالیف سے متعلق خدمات کا تذکرہ تفصیل سے موجود ہے، مصری ادیب طٰہٰ حسین بیسویں صدی کے نامور ادیب اور دانشور ہیں، اس کے ساتھ جدیدیت کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہے، وہ تین برس کی عمر میں ہی نابینا ہو گئے تھے، مگر اپنی مسلسل محنت اور شوق کی وجہ سے علم کے اعلی مدارج طے کرتے رہے، یہاں تک کہ بین الاقوامی طور پر عربی زبان وادب کی دنیا میں معتبر حوالے کے طور پر مسلم مانے جاتے ہیں۔ سولہویں صدی کے ایک نابینا ہندوسنت 'سورداس' تھے، جو شاعر اور گلوکار تھے، کرشن جی کی تعریف میں کلام کہا کرتے تھے، ان کا کلام عموما ہندی ادب کی دو زبانوں اودھی اور برج بھاشا میں ملتا ہے۔ یہ ایک لمبی تاریخ ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، بس نمونے کے طور پر یہ دکھانا تھا کہ انسان اگر کسی کام کا ارادہ کرلے تو وہ مشکل نہیں رہ جاتا، ان نابینا لوگوں کے طلب علم کے شوق اور ان کی خدمات سے بینا حضرات کو سبق لینے کی ضرورت ہے۔

پندرہ اکتوبر کو عالمی طور پر 'نابیناؤں کا دن' ایک ساتھ منا کر دنیا کے نابینا حضرات کے مسائل کے حل کے لیے متحدہ آواز اٹھانا اور ان کو معاشرے کی ایک اکائی کے طور پر تسلیم کرنا ہے، تاکہ انھیں اپنی بصارت سے محرومی کی وجہ سے کسی خفت اور تذلیل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ بھی عزت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں۔

■

Ansar Ahmad Maroofi
Baluwa Kurthi Jafarpur
Mau - 275305 (UP)
Mob.: 8853214848
ansarahmad3567@gmail.com

مضمون

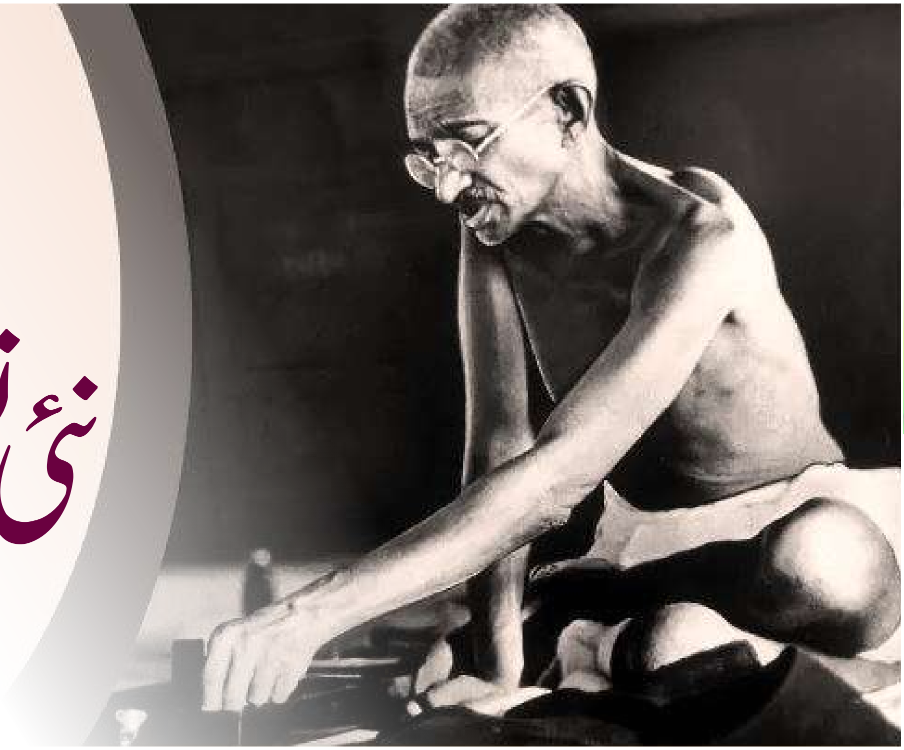

محمد قمر سلیم

نئی تعلیم

بچو! آپ نے اب سے 70 سال پہلے بنی فلم جاگرتی کا یہ گانا تو سنا ہوگا۔

دے دی ہمیں آزادی بنا کھڑگ بنا ڈھال
سابرمتی کے سنت تونے کر دیا کمال

یہی نہیں بلکہ اس میں ایک اور خوبصورت گانا تھا: ہم لائیں ہیں طوفان سے کشتی نکال کے، اس دیش کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے۔ یہ فلم بچوں کے کردار پر بنی تھی اور اس میں ملک کی عظیم شخصیات کو رول ماڈل یا نمونہ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سابرمتی کا لال مہاتما گاندھی کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ ایسی عظیم ہستیوں کی سوانح سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے اپنے کارناموں سے شہرت حاصل کی اور آسمانوں کی بلندیوں پر پہنچ کر تاریخ کے صفحات پر اپنا نام سنہرے حرفوں میں لکھوایا۔ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے ایک نہیں بلکہ لا تعداد لوگوں نے قربانیاں دیں۔ جن میں بہادر شاہ ظفر، رانی لکشمی بائی، اشفاق اللہ خان، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، مولانا حسرت موہانی، علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، ہزاروں علما اور لاکھوں آزادی کے متوالے شامل تھے۔

یوں تو ہر شخص کی قربانی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے لیکن گاندھی جی کو اس لیے خاص طور سے یاد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے آزادی کی لڑائی عدم تشدد یعنی بنا ہتھیاروں کے لڑی۔ بہت سی وجوہات کے ساتھ یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ تھی گاندھی جی کو مہاتما یعنی مہان آتما کا لقب دینے کی۔ آپ جانتے ہیں مہان آتما کسی عظیم روحانی شخصیت

کو کہا جاتا ہے۔ انھیں صرف سیاست کی وجہ سے مہان نہیں کہا گیا بلکہ وہ ایک سماجی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تعلیم بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف تعلیم کا فلسفہ پیش کیا بلکہ ہندوستان کو ایک مکمل تعلیمی نظام دیا۔

بچو! آپ نے جس بنیادی تعلیم کے تحت تعلیم حاصل کی ہے یا کر رہے ہیں وہ گاندھی جی کی ہی دین ہے۔ گاندھی جی نے نئی تعلیم کے نظام کو پیش کیا۔ دراصل گاندھی جی انگریزوں کی تعلیم سے بہت نالاں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کی تعلیم ہمیں غلام بنا رہی ہے۔ ہم اس سے اتنا ہی سیکھ رہے ہیں جتنا انگریز اپنا کام چلانے کے لیے چاہتے ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی تعلیم سے ہم ان کے کام کرنے والے نوکر بن رہے ہیں۔ دوسرے ان کی تعلیم امیروں اور دولت مندوں کے لیے ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی لیے میں نے یہ نظام پیش کرنے کی جرأت کی ہے کہ تعلیم کو خود کفیل ہونا چاہیے۔ تعلیم سے میرا مطلب ہے بچے اور انسان کی تمام جسمانی، دماغی اور روحانی قوتوں کی بھرپور نشوونما...'

کیا آپ کو معلوم ہے کہ گاندھی جی نے اپنی اس تعلیم کو نئی تعلیم کا نام دیا تھا جسے ہم 'بنیادی تعلیمی نظام' کے نام سے جانتے ہیں۔ یہاں آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ 2020 کی نئی تعلیمی پالیسی' گاندھی جی کی نئی تعلیم پر ہی مبنی ہے۔ گاندھی جی جب انگریزوں کے تعلیمی نظام سے پریشان ہو گئے تو انھوں نے 1937 میں مہاراشٹر کے شہر وردھا میں کانگریس کے کنوینشن میں نئی تعلیم کا خاکہ پیش کیا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندوستان کا ہر بچہ خود کفیل ہو اور ملک کی ترقی میں اس کا بھی حصہ ہو اس لیے تعلیم کسی غیر ملکی یا غیر علاقائی زبان میں نہ دے کر مادری اور علاقائی زبان میں دی جائے۔ یہی نہیں بلکہ بنیادی تعلیم حکومت کی ذمے داری ہو اور وہ تعلیم مفت دی جائے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کی نئی تعلیم کیسی تھی؟ گاندھی جی نے کہا تھا کہ 'خواندگی اپنے آپ میں کوئی تعلیم نہیں ہے۔ خواندگی نہ تو تعلیم کی انتہا ہے اور نہ ہی ابتدا ہے... اس لیے میں بچے کی تعلیم کا آغاز اسے ایک کارآمد دستکاری سکھا کر کروں گا اور اسے اس قابل بناؤں گا کہ سیکھنے کے عمل کے ساتھ ہی پیداوار کا عمل بھی شروع ہو جائے۔ اس طرح ہر اسکول کو خود کفیل بنایا جا سکتا ہے۔'

ہمیں یہاں خواندگی اور تعلیم کے فرق کو سمجھنا ہوگا۔ دراصل خواندگی کا مفہوم ہے کہ کوئی بھی بچہ یا شخص زبان پڑھ سکتا ہو، لکھ سکتا ہو اور بنیادی حساب جانتا ہو جس سے وہ زندگی کی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کر سکے جب کہ تعلیم کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ صرف ڈگریاں حاصل کر لینا تعلیم نہیں کہلاتا ہے بلکہ تعلیم میں سماج میں رہنے کا ہنر، سماج کے ساتھ باہمی تعلقات، مختلف تہذیبوں اور روایتوں کی قدر کرنا، اخلاقی قدروں کو سمجھنا، مختلف امور میں مہارت حاصل کرنا، زبان کا صحیح استعمال کرنا، اپنے حقوق کے مطالبے کے ساتھ ساتھ سماج، ملک وقوم کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو نبھانا، خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آنا، آئینی پابندیوں کا خیال رکھنا، بھائی چارے کو فروغ دینا، ملک کی سالمیت اور اپنی شخصیت کے ساتھ ساتھ ہر شہری کی شخصیت کی قدر کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

اپنی نئی تعلیم میں گاندھی جی نے کئی باتوں کو اولیت اور اہمیت دی۔ سب سے پہلی بات جس پر گاندھی جی نے

زور دیا وہ مادری زبان تھی۔ ان کے مطابق ہر بچے کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچہ جتنی خوبصورتی اور انہماک کے ساتھ اپنی بات اپنی مادری زبان میں کہہ سکتا ہے کسی اور زبان میں نہیں کہہ سکتا۔ بچو! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں مادری زبان وہ زبان ہے جو آپ کی اور ہماری امیاں بولتی ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی مادری زبان بچپن یعنی ماں کی گود سے ہی بولتے ہیں۔ اپنی مادری زبان بولتے بولتے ہمیں اپنی مادری زبان میں اعتماد حاصل ہو جاتا ہے اور ہم اپنی بات کو مادری زبان میں بہتر ڈھنگ سے ادا کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی ہی نہیں بلکہ بہت سے تعلیم اور نفسیات کا علم رکھنے والوں نے ابتدائی تعلیم کے لیے مادری زبان کو ہی بہترین وسیلہ بتایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مادری زبان بچے کی سماجی، ادراکی (علم، آگاہی، شعور)، نفسیاتی صلاحیتوں، تہذیب اور شخصیت کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

دوسری اہم بات تعلیم کے سلسلے میں گاندھی جی نے کہی وہ دستکاری کے ذریعے تعلیم دینا تھی۔ انھوں نے دستکاری میں باغبانی و کاشت کاری، چمڑے کا کام، چکنی مٹی کا کام، بانس کی دستکاری، چرخہ، کتائی اور بنائی کا کام، مٹی کے برتن بنانے کا کام، کشیدہ کاری، بڑھئی کا کام، وغیرہ کو اہمیت دی۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم دستکاری پر مرکوز ہونا چاہیے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ طالب علم پڑھائی کے ساتھ ساتھ کسی بھی دستکاری میں ماہرانہ صلاحیتیں حاصل کرلے تاکہ وہ خود کفیل ہوسکے۔ اسے اپنی روزی روٹی کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ وہ کہتے تھے جب بچہ تعلیم مکمل کرکے باہر نکلے گا تو کسی پر بوجھ نہیں بنے گا اور اس کے سیکھے ہوئے مختلف ہنر اور دستکاری ملک کی معیشت میں معاون ثابت ہوں گے۔

تیسری بات انھوں نے یہ کہی کہ طالب علم کو صرف ایک ہی ہنر نہیں سکھانا چاہیے بلکہ اسے اس کی دلچسپی کے مطابق بہت سارے ہنر آنا چاہیے اور اس کی پوری ذمے داری اساتذہ اور اسکول پر عائد ہوتی ہے۔ مختلف ہنر سے مطلب یہ ہے کہ جہاں طالب علم چمڑے کا کام، کتائی بنائی کا کام سیکھ رہا ہے وہیں اسے موسیقی، یوگا، شجر کاری کاری وغیرہ بھی سیکھنا چاہیے۔ لیکن تمام ہنر اس کی دلچسپی کے مطابق ہونا چاہیے۔

چوتھی بات، گاندھی جی نے خود سے کام کرکے سیکھنے پر بہت زور دیا۔ وہ صرف لیکچر دینے کے خلاف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ خود سے کرکے سیکھنے سے طالب علم کام کی اہمیت کو سمجھے گا۔ اسے یہ احساس ہوگا کہ کوئی بھی کام چھوٹا نہیں ہوتا ہے۔ خود سے سیکھنے کے ذریعے بچہ دل، دماغ اور ہاتھوں کے درمیان ربط پیدا کرنا سیکھے گا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہم جب بھی کوئی کام کریں تو ہمارے ہاتھوں کا ربط ہمارے دل و دماغ کے ساتھ ہونا چاہیے تبھی وہ کام بہتر ہوسکتا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے درسی کتاب سے ہٹ کر تعلیم پر زور دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ درسی کتاب کو اہمیت نہیں دی بلکہ درسی کتاب سے ہٹ کر اخلاقی قدروں، سماجی خدمت پر بھی زور دیا۔ یہاں سماجی خدمات سے مطلب ہے کہ بچہ جس محلے یا علاقے میں رہتا ہے وہاں وہ اس میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ سماجی تعلقات پیدا کرے۔ یہ استاد کی ذمے داری ہوگی کہ وہ طالب علم کو

اتنا حساس بنائے کہ وہ اس کے محلے میں رہنے والے لوگوں کے دکھ درد کو سمجھ سکے۔

گاندھی جی نے کسی بھی بات کو صرف کہا ہی نہیں بلکہ وہ ہمیشہ تجربے کرتے رہے۔انھوں نے اپنے افریقہ کے قیام کے درمیان برادری رہائش کے لیے دو آشرم قائم کیے ایک ڈربن میں فینکس سٹلمنٹ اور جوہانس برگ میں ٹالسٹائے فارم۔ ٹالسٹائے فارم 1910 سے 1913 تک چلتا رہا۔افریقہ سے ہندوستان واپس آ کر گاندھی جی نے احمدآباد کے 'کوچراب' علاقے میں 25 مئی 1915 کو آشرم قائم کیا، بعد میں 17/جون 1917 کو یہ آشرم سابر متی ندی کے کنارے قائم کیا گیا اور اس طرح یہ آشرم سابرمتی آشرم کے نام سے مشہور ہوا۔دراصل ان آشرموں کو قائم کرنے کا مطلب تھا سچائی کو تلاش کرنا، عدم تشدد کے ذریعے آزادی کی لڑائی لڑنا اور ستیہ گرہ کے اصل معنی کو عملی طور پر سمجھانا۔ ان آشرموں کے ذریعے گاندھی جی نے لوگوں کو سماج کے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس سے وہ یہ بھی بتانا چاہتے تھے ہر بچے کو کمیونٹی میں رہ کر اس کے مسائل سے روشناس ہونا چاہیے اور اس میں ان مسائل کے حل تلاش کرنے کی صلاحیت اور سماج کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔

اگر ہم گاندھی جی کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالیں تو حیرت ہوتی ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی جس کی وجہ سے ان کی تعلیم پر اثر پڑا۔ شادی کے بعد انھوں نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ ایک سال تک انھوں نے تعلیم حاصل نہیں کی لیکن ایک سال کے بعد جب انھوں نے دوبارہ پڑھائی شروع کی تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے اپنا تعلیمی نظام دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک عظیم رہنما تھے جن کی آواز پر ہندوستانی مرنے اور مارنے پر تیار ہو جاتے تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ بچپن میں وہ بہت شرمیلے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ 'میں بچپن میں ہمیشہ شرمایا شرمایا رہتا تھا اور لوگوں سے بچتا پھرتا تھا۔ میری کتابیں میری ساتھی تھیں۔ ٹھیک گھنٹی کے وقت اسکول پہنچنا، اسکول ختم ہوتے ہی گھر بھاگنا، میری روزانہ کی عادت تھی۔' ہے نہ تعجب کی بات۔ ایسا بچہ جو لوگوں سے ہمیشہ دور رہتا تھا، بڑا ہو کر ہر دلعزیز رہنما بنا۔

اب اگر ہم ہندوستان کی 'نئی تعلیمی پالیسی 2020 پر نظر ڈالیں تو اس میں مختلف زبانوں یعنی مادری زبانوں کے ذریعے تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ کاروبار اور تجارت پر زور دیا گیا ہے۔اسی طرح کمیونٹی میں رہ کر مختلف پیشوں سے جڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کی بات کہی گئی ہے۔ اسکول اور سماج کے درمیان بہتر تعلقات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

غرض یہ کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی کی نئی تعلیم کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کل تھی۔اس کا سب سے بڑا ثبوت ہماری 2020 کی نئی تعلیمی پالیسی ہے۔

■

Mohammad Qamar Saleem
A-47, Zakir Bagh, Okhla Road
New Delhi - 110025
Mob.: 9322645061
qamarsaleemin@yahoo.co.in

رضوانہ سید

باپو نے کہا

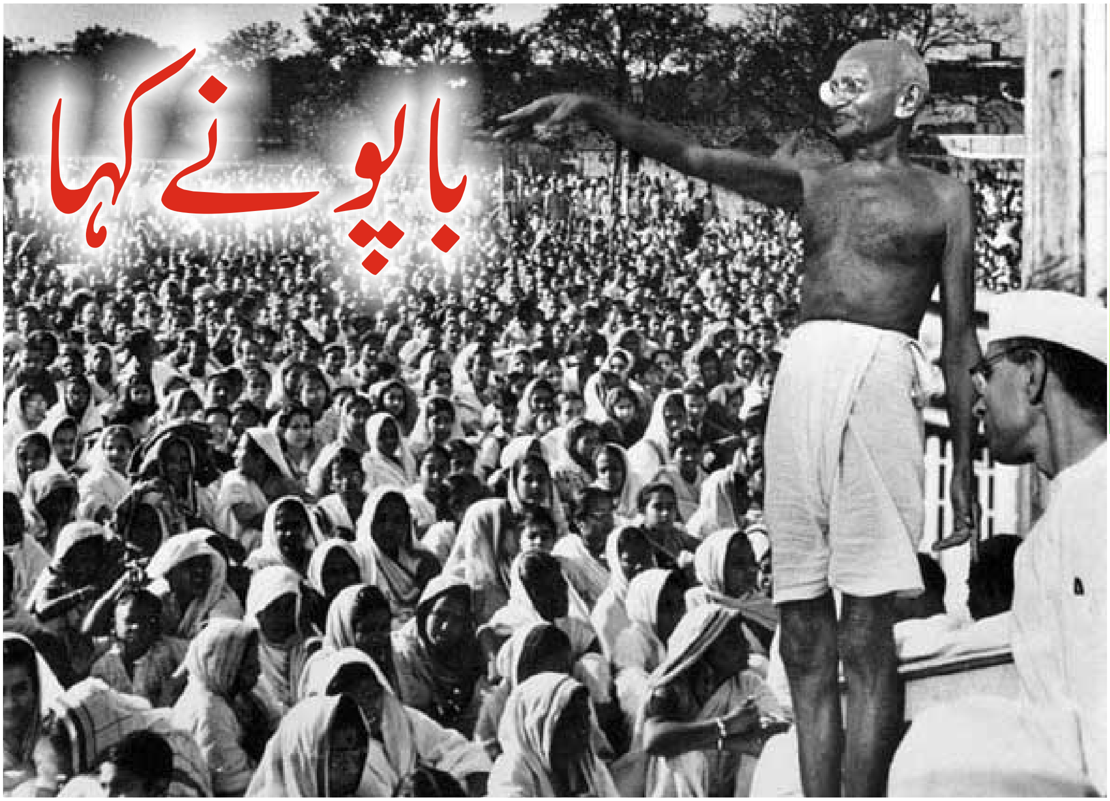

باپو نے کہا:

میرا نام موہن داس، والد کا نام کرم چند گاندھی تھا۔

میری پیدائش 2 اکتوبر 1869 میں صوبۂ گجرات کے کاٹھیاوار ضلع پوربندر نامی مقام پر ہوئی جسے سداما پوری بھی کہتے ہیں۔

بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، گھر والے 'موہانیا' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میں اپنے والد سے بہت ڈرتا تھا مگر والدہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ میری والدہ بڑی نیک اور مذہبی خیال کی تھیں۔ وہ وقت کو پہچاننے والی ہوشیار اور بڑی سمجھدار خاتون تھیں۔ اپنی ریاست کے متعلق معلومات خوب رکھتی تھیں۔ اس لیے راج کوٹ دربار کے محل کی رانیوں میں میری والدہ عقلمند سمجھی جاتی تھیں۔ بچپن میں والدہ کے ساتھ میں بھی راجکوٹ دربار میں جایا کرتا تھا۔

میرے والد ایک سچے انسان تھے۔ اسکول کی تعلیم نہیں تھی۔ تعلیم صرف تجربے سے حاصل کی تھی۔ دلیر اور اچھے منصف تھے، لالچی نہ تھے، رشوت سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے کیونکہ دولت جمع کرنے کا انھیں شوق نہ تھا۔ وہ راج کوٹ دربار میں دیوان تھے اور راج کے بڑے وفادار تھے۔

بچپن پوربندر میں گزرا۔ پانچ برس کی عمر میں پاٹھ شالے میں پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ پہاڑے یاد کرنے میں خاصی مشکل ہوتی۔ اسکول کی زندگی کی تفصیلات تو یاد نہیں ’ہاں‘ اتنا ضرور یاد ہے کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر میں بھی استاد کو برا بھلا کہتا۔ بس یہی خرافات سیکھنے کے

علاوہ اور کچھ نہیں سیکھا۔

اس وقت میری عمر تقریباً سات سال کی رہی ہوگی جب میرے والد پوربندر چھوڑ کر راجستھانی عدالت کے ممبر کی حیثیت سے راج کوٹ چلے آئے۔ راج کوٹ کے دیہاتی پاٹھ شالے میں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ پوربندر کی طرح یہاں کی پڑھائی کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ میں شرمیلا تھا۔ الگ تھلگ رہتا تھا۔ محنت سے پڑھتا تھا، صرف کتابیں میری ساتھی تھیں، روزانہ ٹھیک وقت پر اسکول پہنچ جاتا، اگر صبح کو ناشتہ تیار نہ ہوتا تھا تو باسی روٹی کھا کر اسکول چلا جاتا تاکہ اسکول دیر سے نہ پہنچوں۔ چھٹی ہوتے ہی فوراً گھر بھاگ آتا۔ گھر بھاگنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں کسی سے بات چیت نہ کر پاتا تھا۔ اس لیے میں ڈرتا تھا کہ کہیں لڑکے میرا مذاق نہ اڑائیں۔

ہمارے گھر کے باہر ایک مہتر کا لڑکا کام کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کو 'چھو' لیا تو ماں ناراض ہوگئیں اور کہا ''جاؤ اور ابھی نہاؤ۔'' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر میں یا میرا بھائی کسی بھی مہتر یا چمار کے لڑکے کو 'چھوئیں تو اس میں کون سی ناپاکی ہے۔ مہتر اور چمار بھی ہماری طرح آدمی ہیں۔ اس لیے جب میں بڑا ہوگیا تو 'مہتروں اور چماروں' کے حق کے لیے ہمیشہ لڑتا رہا اور ان کو 'ہریجن' یعنی 'خدا کے بچے' کہا کرتا تھا۔

پھر الفریڈ اسکول میں میرا داخلہ ہوگیا۔ اسکول کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ محکمہ تعلیم کے انسپکٹر 'مسٹر گائلس' اسکول کے معائنہ کے لیے آئے تو انھوں نے لڑکوں سے پانچ الفاظ لکھنے کو کہا۔ اس میں سے ایک لفظ کیٹل (Kettle) یعنی کیتلی کے ہجے مجھے صحیح یاد نہ تھے۔ اس لیے میں نے غلط لکھا۔ استاد کی نظر پڑی۔ انھوں نے اشارہ کیا کہ برابر میں بیٹھے ہوئے لڑکے کی کاپی سے نقل کرلو، میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماسٹر صاحب خود ہی مجھے سامنے کے لڑکے کی کاپی دیکھ کر ہجے درست کرنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ ماسٹر اس لیے مقرر کیے جاتے ہیں کہ کوئی لڑکا دوسرے کی نقل نہ کرسکے۔ سب لڑکوں کے پانچوں لفظ کے ہجے صحیح نکلے۔ ایک میں ہی تھا جس نے ایک لفظ غلط لکھا تھا۔ میری بیوقوفی کا ذکر بعد میں ماسٹر صاحب نے کیا۔ لیکن ماسٹر صاحب کی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اگرچہ اس ماسٹر صاحب کی اور بھی کمزوریاں بعد میں معلوم ہوئیں۔ پھر بھی میں پہلے کی طرح ان کا ادب کرتا رہا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ بڑے بوڑھوں کا حکم بجا لانا چاہیے۔ جو وہ کہیں کرنا چاہیے۔ وہ جو کریں اس کو پرکھنے کا اختیار ہمیں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ والد نے مجھے سکھایا تھا کہ ''اپنے استاد کا احترام کرنا اور ان کی غلطی نہ پکڑنا''

اس وقت دو واقعات اور ہوئے جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ مجھے کورس کی کتابوں کے علاوہ کچھ بھی پڑھنے کا شوق نہیں تھا، لیکن والد صاحب کی خریدی ہوئی کتاب 'شرون پتری بھگتی ناٹک' میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھی۔ شرون کی تصویر بھی دیکھی جس میں وہ اپنے ماں باپ کو بہنگی میں بیٹھا کر 'یاترا' کے لیے جا رہے ہیں۔ اس کتاب اور تصویر نے میرے ذہن پر گہرا اثر ڈالا اور اس طرح شرون جیسا بننے کا خیال دل میں پیدا ہوا۔

اسی دوران ڈرامہ 'ہریش چندر' دیکھنے کا اتفاق ہوا جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ دن رات میں اپنے سے

سوال کرتا کہ آخر ہم 'ہریش چندر' جیسے سچائی پسند انسان کیوں نہیں بن سکتے، جس نے اپنی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی بیوی بچوں کو بھی سچائی کے راستے پر چلتے ہوئے قربان کردیا۔ دل کہتا سچائی کا راستہ اپناؤ۔ چاہے 'ہریش چندر' کی طرح مشکلوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ اس کہانی پر مجھے پورا یقین تھا اور میں اکثر اسے پڑھ کر رو پڑتا تھا۔

جب میں چھٹی جماعت میں آیا تو سنسکرت مجھے جیومیٹری سے زیادہ مشکل معلوم ہوئی۔ جیومیٹری میں رٹنے کی کوئی بات نہ تھی لیکن سنسکرت میں زیادہ کام رٹنے کا تھا۔ میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ سنسکرت کے استاد بھی بڑے سخت تھے۔ وہ سنسکرت کو پڑھنے میں بہت زور دیتے تھے۔ دوسری طرف فارسی کے استاد تھے۔ بالکل مختلف، نرم طبیعت، مہربان اور پسندیدہ شخصیت کے مالک، لڑکے ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ فارسی بہت آسان مضمون ہے۔ میں نے فارسی نہیں پڑھی، البتہ ایک دن فارسی کے کلاس میں ضرور چلا گیا۔ سنسکرت کے استاد کو اس بات پر صدمہ ہوا۔ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا ''تم ہندو ہو ایک 'وشنو' باپ کے بیٹے ہو۔ ہندومت کی سبھی کتابیں اسی زبان میں ہیں۔ کیا تم اپنے مذہب کی زبان حاصل کرنا نہیں چاہتے؟ انھوں نے کہا ''اگر تمھیں سنسکرت مشکل معلوم ہو تو تم میرے پاس آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سنسکرت سیکھو۔ جب تم بڑے ہوگے تو سنسکرت کی دلچسپ کتابیں پڑھو گے؟ تمھیں بددل نہیں ہونا چاہیے۔ تم دوبارہ سنسکرت کے کلاس میں آجاؤ۔ میں استاد کی شفقت دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا اور پھر سے سنسکرت کے کلاس میں جانا شروع کردیا۔

مضمون

یہ واقعہ ساتویں جماعت کا ہے۔اس وقت دورب جی ایڈل جی جمی ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ سخت ڈسپلن رکھتے تھے۔پھر بھی طلبا میں ہر دل عزیز تھے۔ وہ باقاعدہ کام کرتے۔ کام لیتے اور پڑھاتے بھی اچھا تھے۔انھوں نے اونچی جماعت کے طلبا کے لیے ورزش اور کرکٹ لازمی قرار دی۔ میرا جی اس میں نہیں لگتا تھا۔ اس لیے ورزش، فٹ بال یا کرکٹ کے لیے کبھی میدان میں جاتا نہیں تھا۔اب میں دیکھتا ہوں کہ ورزش کی طرف سے میری یہ غفلت بہت بڑی بھول تھی۔اس وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ ورزش کا تعلیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعد میں سمجھ میں آیا کہ علم حاصل کرنے میں ورزش یعنی جسمانی تعلیم وذہن اور دماغی تعلیم کے برابر جگہ ملنی چاہیے۔

میں ایک بھول کی سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔ نہ جانے کس طرح یہ غلط خیال مجھے ہوگیا تھا کہ پڑھائی میں خوش خطی کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال ولایت جانے تک بنا رہا۔ بعد میں تو میں بہت پچھتایا اور شرمایا بھی۔اب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تحریر کا خراب ہونا ادھوری تعلیم کی نشانی ہے۔اس لیے ہر ایک جوان، مرد، عورت کو چاہیے کہ میری اس مثال سے سبق لے اور جان لے کہ خوبصورت تحریر تعلیم کا ضروری حصہ ہے۔

جب میں جیل میں تھا اس وقت مجھے بہت یاد آتے تھے۔میں نے ان کو یہ خط لکھا تھا کہ ”ننھی چڑیو! ایک چڑیا تو خود اپنے پروں سے اڑتی ہے مگر تم بچو! اگر ’پر‘ کے بغیر اڑنا سیکھو تو تمھاری سب مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔ اب میں تم کو ’پروں‘ کے بغیر اڑنا سکھاتا ہوں۔ دیکھو میرے ’پر‘ تو نہیں ہیں پھر بھی میں روز اپنے خیالوں کے ’پروں‘ سے تمھارے پاس آجاتا ہوں۔ یہ وملا بیٹھی ہے۔ وہ ہری ہے، تم بھی اپنے خیالوں کے ’پروں‘ پر میرے پاس اڑتے ہوئے آجاؤ۔ مجھے ایک خط بھیجو جس پر تم سب اپنا نام اپنے ہاتھ سے لکھنا جسے نہ آئے وہ کراس بنادے۔“

باپو کی دعائیں

جہاں تک مجھے یاد ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کو کبھی قابل نہیں سمجھا۔ زندگی میں صرف یہ تمنا کی کہ اچھا بنوں۔ مجھے اپنے کردار کا بہت خیال رہتا تھا۔ میرا کردار ذرا بھی کہیں گرتا تو مجھے رونا آجاتا۔ میرے لیے برداشت سے باہر تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی بات ایسی ہوجائے جس سے استاد کو شکایت کا موقع ملے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مار کھانی پڑی تھی جس پر میں دہائی دے دے کر رویا تھا۔رونے کی وجہ مار کھانے کا دکھ نہ تھا لیکن اس بات کا پچھتاوا تھا کہ مجھے سزا کا مستحق سمجھا گیا۔

اپنے تجربوں کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں، گرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ میں انھیں بخوبی بیان کرسکا ہوں یا نہیں لیکن اتنا کہہ تو سکتا ہوں کہ میں نے انھیں سچائی سے ٹھیک ٹھیک بیان کردیا ہے۔ میری زندگی کا اہم مقصد یہ رہا ہے کہ حق کو جیسا کہ خود میری آنکھوں نے دیکھا ہے ویسا ہی بیان کردوں۔ میری پرخلوص خواہش ہے کہ اس کو پڑھنے والے ’حق اور اہنسا‘ پر اپنا یقین پختہ کریں۔

■

Rizwana Syed
Ismail Manzil, Plot No: 131/5
House No: 5-2-30, Tirumala Nagar
Near Sri Veeranjaneye Swam Temple
Hyderabad - 500040 (Telangana)

نظم

کوثر صدیقی

باپو جینتی آؤ منائیں

باپو جینتی آؤ منائیں
لے کر پھولوں کی مالا آئیں
ان کی سمادھی چل کے سجائیں
باپو جینتی آؤ منائیں
باپو ہمارے زندہ باد

سب کے پیارے باپو ہمارے
سب سے نیارے باپو ہمارے
سب کے سہارے باپو ہمارے
باپو جینتی آؤ منائیں
باپو ہمارے زندہ باد

درس اہنسا سب کو پڑھایا
دیش کو بھی آزاد کرایا
انگریزوں کو مار بھگایا
باپو جینتی آؤ منائیں
باپو ہمارے زندہ باد

پریم کا سب کو پاٹھ پڑھایا
چھوٹے بڑے کا فرق مٹایا
سیدھا رستہ سب کو بتایا
باپو جینتی آؤ منائیں
باپو ہمارے زندہ باد

ایشور اللہ ایک بتایا
پریم کا درپن سب کو دکھایا
بچھڑے ہوؤں کو آگے بڑھایا
باپو جینتی آؤ منائیں
باپو ہمارے زندہ باد

ہندو مسلم سب کے پیارے
دین دکھی لوگوں کے سہارے
جگ میں یکتا باپو ہمارے
باپو جینتی آؤ منائیں
باپو ہمارے زندہ باد

دیش کی خاطر جان گنوا دی
پھر بھی برے لوگوں کو دعا دی
مر کے اَمر اِک جوت جلا دی
باپو امر ہیں باپو امر ہیں
باپو ہمارے زندہ باد

■

Kausar Siddiqui
Dabistan-e-Bhopal
79, A, Ginnori Main Road
Bhopal - 462001 (MP)
Mob.: 9926404171

نظم

ارشاد احمد ارشاد

اردو زباں ہماری

اردو زباں ہماری
میٹھی ہے سب سے پیاری
آغوش میں یہ آئی
ماں نے ہمیں سکھائی
اس کے حروف جتنے
آسان مجھ کو لگتے
لفظوں میں حسن ایسا
پریوں کے حسن جیسا
جب سامنے یہ آئیں
دل کو بھی خوب بھائیں
جملوں میں وہ روانی
بہتا ہو جیسے پانی
اردو زباں جو بولے
کانوں میں رس وہ گھولے
تہذیب کا سمندر
پوشیدہ اس کے اندر
الفت بھری ہے جس میں
نفرت نہیں ہے اس میں
سب کو گلے لگاتی
اپنا ہے یہ بناتی
اس سے سلیقہ آئے
جینا ہمیں سکھائے
اپنا یہی ہے کہنا
اردو کو پڑھتے رہنا
اردو پڑھو پڑھاؤ
آگے اسے بڑھاؤ

■

Irshad Ahmad
House No - 1206, Gali No - 39/4
Jafrabad
Delhi - 110053
Mob.: 7011543560

جاوید رانا

میٹھی زبان اردو

نظم

بچے جوان بوڑھے سب کی ہے جان اردو
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

تسکین روح و دل ہے، جان جہان اردو
کیف و سرور سامع، لطف بیان اردو
فکر و نظر کی وسعت، امن و امان اردو
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

نرگس، گلاب، سوسن، چمپا، کنول، چمیلی
نسرین، لاجونتی، بیلا، کنیر، جوہی
سنبل، بنفشہ، لالہ یا ہے یہ رات رانی
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

ممبئی کی آن اردو، دلی کی شان اردو
ہے قومی ایکتا کا نام و نشان اردو
ناز و ادا سے بولے ہندوستان اردو
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

گجری ہے، لشکری ہے، دکنی ہے، ریختہ ہے
تصویر فارسی ہے، ہندی کا قاعدہ ہے
آئینۂ عرب ہے انبار السنہ ہے
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

ہیں پھول گلستاں کے الفاظ اس کے سارے
کاغذ کے آسماں پر جگ مگ کریں ستارے
یا دودھ میں نہا کر آئے ہیں ماہ پارے
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

پنجاب میں کھلی ہے کشمیر کی کلی ہے
بیٹی ہے لکھنؤ کی دکن میں یہ پلی ہے
شربت ہے شہد ہے یا مصری کی یہ ڈلی ہے
پیاری زبان اردو، میٹھی زبان اردو

حاکم، غلام، افسر، بابو بھی بولتے ہیں
عیسائی، سکھ، مسلماں، ہندو بھی بولتے ہیں
صوفی، فقیر، پنڈت، سادھو بھی بولتے ہیں
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

بنیاد جس کی الفت، جس کا خمیر چاہت
ہے سر بسر محبت، یکجہتی جس کی فطرت
دنیا میں تاقیامت یارب رہے سلامت
پیاری زبان اردو میٹھی زبان اردو

■

Javed Rana
Near Char Mazar
Dr. Zakir Husain, Ward Mominpura
Burhanpur - 450331(Madhya Pardesh)
Mob.: 9009234875
Email.: javedrana184@gmail.com

نظم

پنکھا

رخشاں ہاشمی

بچو! میں ایک پنکھا ہوں
تین ٹانگ کا ہوتا ہوں
آتا ہوں میں سب کے کام
دیتا ہوں سب کو آرام
گرمی دور بھگاتا ہوں
ٹھنڈی ہوا کھلاتا ہوں
میں بجلی سے چلتا ہوں
آن کرو چل پڑتا ہوں
مجھ سے راحت گرمی میں
میری ضرورت گرمی میں
دن بھر چلتا رہتا ہوں
کہاں کبھی میں تھکتا ہوں
رات کو بھی آرام کہاں
گرمی میرے نام یہاں
ہاں سردی میں سوتا ہوں
چین کی نیند بھی لیتا ہوں

چھت سے بھی میں لٹکتا ہوں
ٹیبل پر بھی ہوتا ہوں
واٹر کولر کے اندر
اور اے سی کے بھی باہر
ہر جگہ پایا جاتا ہوں
تیز ہوا پھیلاتا ہوں
سب کے آتا ہوں میں کام
سب لیتے ہیں میرا نام
بچو! یوں پنکھا ہوں
لیکن بڑے کام کا ہوں
سب مجھ پر ہی مرتے ہیں
بن میرے نہیں جیتے ہیں

■

Rakhshan Hashmi
Rizwi Colony
Shah Zubair Road
Munger (Bihar)
Mob.: 9304342562
r.crazy.rr@gmail.com

نظم

ترانۂ سائنس

ہے تابناک زمانہ زمین والوں کا
فلک پہ ہوگا ٹھکانہ زمین والوں کا
ہے ماہ و مشتری مریخ پر نگہ ان کی
دمک رہی ہے خلاؤں میں شاہراہ ان کی
ستاروں پر ہے نشانہ زمین والوں کا
فلک پہ ہوگا ٹھکانہ زمین والوں کا
یہ انکشاف کا ایجاد کا زمانہ ہے
اک اک زبان پہ سائنس کا ترانہ ہے
بدل رہا ہے زمانہ زمین والوں کا
فلک پہ ہوگا ٹھکانہ زمین والوں کا
زباں زباں پہ ہے سائنس آگہی کا کلام
میں کہہ رہا ہوں خلاؤں میں رہبری کا کلام
کہ ہوگا تاروں پہ جانا زمین والوں کا
فلک پہ ہوگا ٹھکانہ زمین والوں کا
قدم قدم پہ تواریخ نو بنائے گا
نئ زمیں، نئ دنیا ضرور پائے گا
جو قافلہ ہے روانہ زمین والوں کا
فلک پہ ہوگا ٹھکانہ زمین والوں کا
اک اک نگاہِ منور نشان پائے گی
خلاؤں میں کئ روشن جہان پائے گی
ضروری ہے جہاں جان زمین والوں کا
فلک پہ ہوگا ٹھکانہ زمین والوں کا

■

Munawwar Danapuri
Mohalla: Shahtoli
Post: Danapur, Cant District
Patna - 801503 (Bihar)
monawwerrizvi1947@yahoo.com

نظم

ثناء اللہ دوگھروی

ہم بچے

ہم پیارے پیارے بچے ہیں ہم اچھے سچے بچے ہیں
ہم عقل کے گرچہ کچے ہیں پر اپنی دھن کے پکے ہیں

ہم عمر میں گرچہ ہیں چھوٹے لیکن اپنے ہیں عزم بڑے
اک دن پرچم لہرائیں گے ہم چاند ستاروں سے آگے

ہم علم و ہنر کر کے حاصل اک دن بن جائیں گے قابل
یعنی ہم علم کی دنیا کے بن جائیں گے ماہ کامل

یہ ملک ہمارا ہے گلشن ہم بچے اس کے گل بوٹے
ہم فکر و عمل کی خوشبو سے اس گلشن کو مہکائیں گے

ہم اچھی باتیں سیکھیں گے اوروں کو بھی سکھلائیں گے
ہم راہ سے بھٹکے لوگوں کو سیدھا رستہ دکھلائیں گے

دریا کے جیسے ہم بھی سدا بس آگے بڑھتے جائیں گے
رکنے کا نام نہیں لیں گے ہم اپنی منزل پائیں گے

ہم جہل کی تاریکی ساری دنیا سے دور بھگائیں گے
ہم علم کی جوت جگائیں گے اس عالم کو چمکائیں گے

■

Sanaullah Sana Doghravi
C/o: Book Emporium
Sabzi Bagh
Patna - 800004 (Bihar)
sanadoghravi@gmail.com

کہانی

تدبیر

مشتاق کریمی

ارحم پھر اپنے ابو سے ناراض ہو گیا۔ ہر ہفتے دو ہفتے میں ایسا ہی ہوتا۔ ابو اسے موبائل سے دور رہنے کی تلقین کرتے۔ وہ سنی ان سنی کر دیتا۔ ابو اپنی آواز کچھ اونچی کرتے تو وہ ہونہہ... ہاں میں جواب دیتا مگر اس کی نظریں موبائل کے اسکرین پر ہی ٹکی رہتیں۔ اس پر ابو کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ چلا اٹھتے۔ ارحم کے ہاتھ سے موبائل چھین لیتے۔ پھر وہ ناراض ہو جاتا۔ منہ پھلا لیتا۔ چہرے پر غصہ اور آنکھوں میں آنسو صاف نظر آتے۔ پھر وہ کھانا پینا چھوڑ دیتا۔ امی شور سن کر دوڑی چلی آتیں۔ ارحم کو سینے سے لگا تیں۔ محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتیں، پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہتیں ”پیارے ارحم ابو تمھارے دشمن نہیں سچے دوست ہیں۔ مگر تم نے موبائل کو اپنا سچا دوست سمجھ لیا ہے۔ ابو بھلا اپنے دوست یعنی تمھاری دوری کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ اور مجھ کو بھی تمھاری یہ بات بہت کھلتی ہے ارحم! چلو اب غصہ چھوڑو اور کچھ کھا پی لو۔“

وقت گزرتا گیا۔ ارحم کی موبائل سے دوستی مزید گہری ہوتی گئی۔ اس دوستی نے والدین سے اس کی دوری کو اور بڑھا دیا۔ موبائل کے عشق میں گرفتار ہونے سے پہلے وہ اپنے والدین سے کتنی باتیں کرتا۔ عجیب عجیب سوالات پوچھتا جواب ملنے پر خوش ہوتا۔ بازار چلنے کی فرمائش کرتا۔ ضد کر کے میلوں ٹھیلوں میں لے جاتا۔ روزانہ اسکول جاتا، گھر کا کام کرتا، رات ابو جب اپنے دوستوں کے ساتھ نکڑ پر ہوتے تو انھیں فون کر کے بلاتا۔ اگر انھیں آنے میں دیر ہوتی تو ناراض ہو جاتا۔

ادھر ایک عرصے سے ارحم کے رویے میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ میلوں ٹھیلوں، بازاروں کی

فرمائش نہ کرتا۔ اسکول تو روزانہ جاتا مگر جاتے وقت پہلے جیسی چمک چہرے پر نہ ہوتی۔ اداس چہرہ، مایوس قدم اور بس۔ ہاں مگر گلی کے نکڑ پر آٹو رکشے سے اترتے ہی دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوتا، ادھر جوتے ادھر موزے پھینک دیتا۔ پیٹھ پر لٹکا ہوا اسکول بیگ کہیں کونے میں رکھ دیتا اور موبائل پر بھوکے شیر کی طرح جھپٹ پڑتا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر موبائل کے سحر میں ڈوب جاتا۔ موبائل دیکھتے دیکھتے یونیفارم تبدیل کرتا۔ ہلکا ناشتہ کرتے وقت بھی آنکھیں اسکرین پر ہی جمی رہتیں۔ مغرب کی اذان فضا میں گونجتی تب بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ امی کچن سے پکارتیں ”ارحم! نماز کو نہیں جانا ہے کیا؟“ وہ روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اسکول سے لوٹنے پر اس کا یہی معمول بن گیا تھا۔ نہ اب وہ اپنے ابو سے سوالات پوچھتا، نہ انھیں فون کر کے گھر بلاتا، نہ سنجیدگی سے ہوم ورک کرتا، بس گم صم اور اداس رہتا اور موبائل سے دور رہنے کے مشورے پر برا مان جاتا۔

”کیا جی! ارحم موبائل کا دیوانہ ہو گیا ہے، کچھ کیجیے نا۔“

”ہاں کچھ تو کرنا پڑے گا۔ اسی تعلق سے سوچ رہا ہوں ویسے اس کے لیے قصوروار ہم ہی ہیں۔“

ایک دن بس میں سوار ہوتے وقت بھیڑ بھاڑ میں ابو کا مہنگا اینڈرائڈ فون چوری ہو گیا۔ جس میں ان کا بہت اہم ڈیٹا بھی تھا۔ آج کل چوری کیا ہوا ٹرک نہیں ملتا تو موبائل کی کیا بساط۔ موبائل چور نے پورے گھر بار کی جیسے خوشیاں چرا لی تھیں۔ سبھی خاموش تھے۔ امی نے کہا ”جو ہونا تھا ہو گیا۔ یوں سمجھیے جان کا صدقہ گیا۔ چلیے کھانا کھا لیجیے۔“ رات کا کھانا ہو چکا تھا۔ امی دھلے ہوئے کپڑوں کو درمیانی کمرے میں تہہ کر رہی تھیں۔ ابو ہال میں لیٹے چھت کو گھور رہے تھے۔ ارحم ان کی بغل میں ہی لیٹا پتہ نہیں کن خیالات میں گم تھا۔ ایک عجیب سا سناٹا تھا۔

”ابو کیا اب نیا موبائل نہیں خریدیں گے؟“

”کیوں تمھارا دل نہیں لگ رہا ہے؟“

”ہاں یاد تو آ رہی ہے۔“

”بیٹے جو ہوا اچھا ہی ہوا دیکھو کتنا سکون ہے کمرے میں۔“

”ہاں سو تو ہے۔ مگر مجھے یاد آ رہی ہے، امی کا موبائل تو کسی کام کا نہیں ہے۔“

دوسرے ہی روز ابو گھر میں تعلیمی تاش لے آئے۔ رات کے کھانے کے بعد امی ابو اور ارحم نے بیٹھ کر تعلیمی تاش کھیلنے کی شروعات کی۔ شروع شروع میں ارحم کو کچھ زیادہ سمجھ نہیں آیا مگر پھر آہستہ آہستہ حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کا طریقہ وہ سیکھ گیا۔ کون سا کارڈ روکنا ہے، کون سا پھینکنا ہے، ایک کارڈ مل جانے سے کون سا لفظ بن جائے گا۔ اس جانب اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا اور پھر وہ اس کھیل میں ماہر ہو گیا مگر ایک ہی طرح کا کھیل وہ کب تک کھیلتا۔ ایک دن اس نے گھروندا بنانے کی فرمائش کی۔ امی ابو دونوں بہت خوش ہوئے۔ سنیچر کے روز مٹی کے علاوہ جن چیزوں کے لیے ارحم نے کہا تھا، وہ سب جمع کر لی گئیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اتوار کو گھروندے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ امی ابو دونوں حیرت زدہ تھے۔ مٹی میں مناسب مقدار میں پانی ملانا، اسے گوندھنا، گوندھی ہوئی مٹی سے دیواریں، کمرے بنانا، یہاں تک کہ چھت پر پرندوں کی غذا کے لیے چھوٹے برتن بنانا۔

ارحم کو تو سب پتہ تھا!

''ارے ارحم تم ہمیں کام کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہو۔ کیا تم نے یہ کام پہلے کیا ہے؟''

''ہاں''

''کہاں؟''

''خوابوں میں۔''

ابو حیران تھے!

''ابو میں نے موبائل پر بار بار گھروندے بنانے کا طریقہ دیکھا ہے۔'' ارحم مسکراتے ہوئے بولا۔

امی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ انھوں نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے ارحم کا ماتھا پونچھا۔ پھر ایک گلاس شربت اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس طرح اب گھر میں کنچے لائے گئے، لال، نیلے، ہرے پیلے۔ ان رنگوں نے ارحم کا دل موہ لیا۔ کنچوں کا کھیل بھی اسے پسند آیا۔ کچھ مرغیاں بھی پالی گئیں۔ جو جلد ہی ارحم کے لیے پیاری، دلاری ہو گئیں۔ ارحم کے اصرار پر ایک بکری بھی خریدی گئی۔ اب ارحم خوش دلی کے ساتھ اسکول جاتا۔ اساتذہ بھی اس کی شخصیت کی تبدیلی اور ذہانت دیکھ کر پذیرائی اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ اب پہلے کی طرح ہی اسکول سے واپسی پر وہ دوڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوتا۔ جوتے، موزے اور اسکول بیگ قرینے سے رکھتا۔ پھر مرغیوں کی خبر گیری کرتا۔ انھیں دانہ ڈالتا۔ بکری کی ملائم جلد پر ہاتھ گھماتا۔ اسے چارہ ڈالتا۔

ایک روز ابو خوشی خوشی گھر آئے۔ اس وقت ارحم اپنی مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔

''اجی سنتی ہو، ارحم سنو، اپنا موبائل مل گیا!'' امی تو دوڑتی ہوئی کچن سے باہر آ گئیں مگر ارحم اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

وہ ہنوز مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ مرغیاں دانوں کی للک میں اس کے قریب آتیں اور اپنی گردنیں اونچی کر دیتیں۔ کبھی وہ ایک دوسرے کو ٹھونگ بھی مار دیتیں۔

رات کے کھانے کے بعد ہال میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابو نے موبائل کے کھو جانے اور ڈرامائی طور پر مل جانے کی داستان سنائی۔ ارحم نے سوال کیا ''ابو اس موبائل کے کھو جانے پر آپ نے دوسرا موبائل بھی نہیں خریدا اور گھر میں ٹیلیفون بھی نہیں ہے امی کا موبائل خراب پڑا ہے تو پھر دفتر کے پیغامات آپ کو کیسے مل رہے تھے؟۔'' ارحم کے چہرے پر عجیب اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ امی ابو کچھ دیر سکتے میں آ گئے۔ پھر سبھی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''ابو اب ایک کام اور کر دیجیے۔ کوئی اردو اخبار اور رسالہ بھی لگا لیجیے۔ ان پرچوں سے ذہنی پرورش ہوتی ہے۔ آج اسکول میں ایک مہمان آئے تھے۔ کہہ رہے تھے اردو ہماری مادری زبان ہے۔ اگر ماں گھر نہ آئے گی تو برکت کہاں سے رہے گی۔'' امی ابو کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ پھر دوسرے ہی دن سے روزانہ گھر میں نئے نئے سنگھار کر کے ماں آنے لگی۔ اردو پرچوں، رنگ برنگی کنچوں، چنچل مرغیوں، تعلیمی تاش کے پتوں اور خوبصورت بکری نے ارحم کو اپنی محبت میں گرفتار کر لیا تھا۔

■

Mushtaq Karimi
342, Shani Peth
Jalgaon - 425001 (Maharashtra)
Mob.: 9028222348
mushtaqkarimi@rediffmail.com

اقبال برکی

بچوں کی دنیا

ٹیکسٹائل مل مزدور عقیل آج کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ ادھر کئی دنوں سے اسے اپنے مستقبل کی فکر پریشان کیے ہوئے تھی۔ ایک بیٹا، جواب پانچویں درجے میں تھا، لیکن پڑھائی لکھائی میں کمزور، اتنا کہ آئے دن اسکول سے شکایت آتی کہ توجہ دیں، پڑھائی لکھائی میں بہت کمزور ہے لیکن شرارت میں بہت آگے۔ روزانہ نت نئی شرارت سے ماسٹر صاحب عاجز ہیں۔

بیوی کم پڑھی لکھی تھی، اس لیے گرہستی میں کمزور اور سلیقے کی کمی، کرائے کا مکان، اجرت کم اور اس پر سے بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی پریشان ہوتا، کیونکہ آگے سب اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔ کہیں سے کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے کئی متبادل بھی سوچے لیکن غیر یقینی کامیابی اسے پھر اسی مل میں لا کھڑا کرتی۔ یہاں آ کر اس کے ان پراگندہ خیالات پر کچھ دیر کے لیے جمود طاری ہو جاتا۔ ادھر ادھر بھٹکنے والے خیالات پر ایک ٹھہراؤ آ جاتا اور اسے یہ سوچ کر چین آ جاتا کہ یہی مزدوری آسان ہے کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔ لیکن جب دوبارہ اس کے خیالات کی آندھیاں شروع ہوتیں تو پھر بہت پریشان کرتیں۔ کئی دن اسی طرح گزر جاتے۔ دوبارہ گھوم پھر کر وہ اسی مل میں پناہ لیتا۔ لیکن خیالات کی یہ آوارہ گردی جب کم ہوتی تو اس کے دل میں ایک خلش، ایک بے چینی چھوڑ جاتی۔ حالانکہ وہ روزانہ مل میں بننے والے کپڑوں کے تانوں بانوں سے کھیلتا، ان سے الجھتا، بچتا اور انھیں اپنے ہاتھوں میں نچاتا پھر انھیں مشین کے حوالے کر دیتا اور نت نئے کپڑے بنا کے تیار کر دیتا۔ یہ تانے بانے تو سلجھ جاتے لیکن اس کی زندگی کے تانے بانے کسی طرح سلجھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

ایک دن حسب معمول وہ گیارہ بجے کے قریب ٹیکسٹائل مل کے باہر آیا۔ قدم خود بخود گلی کے نکڑ پر موجود ٹی اسٹال کی طرف اٹھنے لگے۔ جیب ٹٹولا اور جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں دس کا اکلوتا نوٹ پھنسا ہوا تھا۔ باہر آنے والا ہاتھ اس کے جیب کو بالکل خالی کر آیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر ابھی چائے پی لے گا تو شام کی چائے کا کیا ہوگا؟ اس نے چائے کا خیال ترک کیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ پلٹتے ہی اس کی نظر گلی میں کچھ دور پر موجود بھیڑ پر پڑی۔ نظر وہیں جم گئی۔

اس نے دیکھا کہ لوگ آپس میں دھکم پیل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر گر پڑ رہے ہیں۔ لاشعوری طور پر

اس کے قدم بھی اسی طرف بڑھتے چلے گئے۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں ایک کتاب کی دکان ہے اور ایک کتب فروش کتابیں بیچتا ہے۔ لیکن اس وقت وہاں یہ بھیڑ اور آپس میں دھکا مکی کیوں؟ ہر کوئی اپنے سے آگے والے سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا ہے تو آخر بات کیا ہے؟ یہی سب خیالات لیے وہ بھی ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کئی ایسے چہرے ہیں جنھیں وہ جانتا پہچانتا ہے۔ اس نے سب سے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟

''بچوں کی دنیا آئی ہے۔ جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اتنی بھیڑ ہے۔''

''بچوں کی دنیا آئی ہے؟'' وہ بھونچکا سا اس کی صورت تکے جا رہا تھا۔

''کتاب ہے۔ ہر مہینے آتی ہے۔ اچھی ہوتی ہے۔ بچے شوق سے پڑھتے ہیں۔''

اسے حیران دیکھ کر اس آدمی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

عقیل کے دل میں اس آدمی کی باتوں کا آخری حصہ کھُب گیا۔ 'بچے شوق سے پڑھتے ہیں۔' اس نے سوچا مگر میرے بیٹے کو تو ٹھیک سے پڑھنا بھی نہیں آتا پھر وہ کتاب کیا پڑھے گا؟

ابھی عقیل کے خیالات ایسے ہی الجھے تھے کہ وہی آدمی دوبارہ بول پڑا، ''تیرا بیٹا بھی تو اسکول جاتا ہے نا؟ لے لے۔ وہ بھی پڑھے گا۔''

''ہوں...'' عقیل کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔ اس کی اندرونی کشمکش چہرے سے عیاں تھی۔

وہ وہاں سے واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا 'کتاب لے کر کیا کروں۔ بیٹے کو نہ شوق ہے نہ اسے کوئی بڑا آدمی بننا ہے، اور نہ ایسی اپنی قسمت ہے! اور پھر میرے پاس تو صرف یہی دس روپے ہیں۔ کتاب پتہ نہیں کتنے کی ہے؟ اتنے میں آئے گی بھی کہ نہیں اور اگر میں لے بھی لوں تو پھر شام کی چائے...؟' اس کے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔

وہ واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔ واپس لوٹ جانے کے لیے وہ گھومنا ہی چاہا تھا کہ اس آدمی نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''عقیل لے لے۔ دس روپے میں ایسی کوئی کتاب نہیں ملے گی!''

عقیل کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ چائے اور کتاب۔ کتاب اور چائے... اچانک اسے اپنے ایک دور کے رشتے دار کی بات یاد آ گئی۔ بہت پہلے کی بات ہے۔ وہ کسی کام سے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔ جب خود اس کے ابا نے اسے اسکول سے اٹھا لینے اور کوئی کام پر لگا دینے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ انھیں سمجھاتے ہوئے بول رہے تھے۔ انھوں نے اس کے ابا سے کہا تھا، ''الطاف، چاہے ایک وقت بھوکا رہ لیکن بچوں کو پڑھا۔ تعلیم سے بڑی کوئی دولت نہیں ہے۔''

انھوں نے اس کے ابا کو بہت سمجھایا لیکن انھوں نے عقیل کو اسکول سے اٹھا لیا اور تب سے عقیل ٹیکسٹائل مل میں رات دن خونِ جگر جلاتا ہے اور اپنے اندھیرے گھر کو روشن کرنے کو کوشش کرتا رہتا ہے۔

اسی کے ساتھ جیسے اس کے دل نے خود بخود ایک اٹل فیصلہ کر لیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک وقت کی

چائے نہیں پیے گا لیکن کتاب ضرور خریدے گا۔ بیٹا پڑھے یا نہ پڑھے وہ کتاب ضرور خریدے گا۔ اس نے اسی آدمی سے پوچھا، ''کتاب کتنے کی ہے؟''

اس نے کہا، ''صرف دس روپے کی!''

عقیل کوئی جواب دیے بغیر مجمع میں گھس گیا اور جلد ہی کتب فروش کے ہاتھ میں دس کا نوٹ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کتب فروش نے ایک پرچہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ عقیل پرچہ لیے دوبارہ مل میں چلا آیا۔ وہ حیران تھا کہ ایسی رنگین چمکدار اور چکنے کاغذ والی کتاب صرف دس روپے میں ملتی ہے۔ اس نے سوچا یہ تو بہت سستی ہے!

شام کو جب وہ گھر پہنچا تو اس کا بیٹا گھر پر ہی تھا۔ عقیل کے ہاتھ میں ایک نئی، رنگین کتاب دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا اور کتاب لے کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے وہیں سے پوچھا، ''ابو کس کی کتاب ہے؟''

عقیل نے جواب دیا، ''ہماری ہے۔ ہم پڑھیں گے۔''

بیٹے نے کہا، ''پہلے میں!'' اور وہ کتاب کے اوراق الٹ الٹ کر ان پر بنی تصویریں دیکھنے لگا۔

دوسرے دن عقیل حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ لیکن جب شام کو گھر آیا تو اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا وہی کتاب لیے بیٹھا ہے اور ایسا کھویا ہے کہ آس پاس سے بے خبر ہے۔ اب عقیل ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' لانے لگا۔ چند مہینوں بعد وہ ایک عدد 'امنگ' بھی لانے لگا۔

سالانہ امتحان ہوا تو عقیل کو یقین نہیں آیا کہ اس کا بیٹا پاس ہو گیا ہے۔ عقیل نے سوچا دس روپے کا نوٹ کام آ گیا۔

مل مزدور عقیل کا اب معمول ہو گیا تھا کہ وہ اپنی مزدوری کا کچھ حصہ نئی کتابیں خریدنے میں لگا دیتا اور بیٹا انھیں شوق اور دلچسپی سے پڑھتا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس کا اسکول کا نتیجہ بھی بہتر سے بہتر ہوتا گیا۔ مہینے سال بنتے گئے اور آخر عقیل جیسے ایک مل مزدور کے بیٹے کا داخلہ میڈیکل میں ہو گیا۔ اب وہ ڈاکٹر بن سکتا تھا۔ عقیل اتنا سارا خرچ نہیں برداشت کر سکتا تھا لیکن بیٹے کے استادوں اور جاننے والوں نے اس کی مدد کی اور بتایا کہ کئی ادارے ہیں جو ایسے بچوں کی امداد کرتے ہیں۔ چند سال بعد بیٹا ڈاکٹر بن کر گھر لوٹا۔ اب اس کا اپنا ایک مطب ہے اور وہ روزانہ صبح شام مطب پابندی سے جاتا ہے۔

آج بھی جب بیٹا مطب چلا جاتا ہے اور عقیل اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا رہ جاتا ہے تو وہ 'بچوں کی دنیا' کا وہی 'پہلا شمارہ' نکال کر اسے محبت اور عقیدت سے دیکھتا رہتا ہے، اس کے اوراق پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس دوران ایک سحر انگیز سی مسکراہٹ مسلسل اس کے چہرے پر کھیلتی رہتی ہے۔ وہ اکثر سوچتا ہے کہ اس دن اگر وہ شام کی چائے پی لیتا تو۔۔۔ اس کے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پاتا۔ اس کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی ناچ اٹھتی ہے۔ وہ فوراً اس خیال کو دل سے جھٹک دیتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ہمیشہ ایک سکون ملتا ہے اور تسلی ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی قربانی کا اسے ایسا بڑا صلہ ملا ہے۔ سچ ہے تعلیم سے دنیا بدل جاتی ہے۔ بچوں کی دنیا بدل جاتی ہے۔

■

Dr. Iqbal Berki
155, MHADAD, Noor Bagh
Malegaon - 423203,Distt: Nasik (Maharashtra)
Mob.: 8329273266
dr.iqbalbarki@gmail.com

شاہ تاج

ہماری زمین

فرحان بیگ اپنے پوتے کا بے صبری سے انتظار کررہے تھے جو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آج گاؤں واپس آرہا تھا۔فرحان بیگ بہت خوش تھے لیکن آج انھیں اپنے بیٹے روشن بیگ کی بہت یاد آرہی تھی۔ان کا بیٹا جب دیس کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوا تھا تب ان کے پوتے آفتاب کی عمر صرف 7 سال تھی۔اب عمر تو ان کی 75 سال ہوگئی تھی لیکن پوتے کی ذمے داری نے انھیں بوڑھا نہیں ہونے دیا تھا۔آج وہ کھیت میں اپنی نگرانی میں کام کرانے صبح ہی پہنچ جایا کرتے تھے۔

آفتاب کی والدہ اور دادی بار بار دروازے تک جارہی تھیں۔انتظار کی یہ گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں۔آفتاب کو اسٹیشن پر اس کے استاد محمد علیم اور کچھ دوست لینے گئے تھے۔جیسے ہی گاؤں میں ڈھول بجنا شروع ہوا تو تینوں سمجھ گئے کہ آفتاب آگیا ہے۔ایک کسان کا پوتا اور فوجی کا بیٹا(Pedologist) مٹی کے علم کا ماہر بن کر واپس اپنے گاؤں آرہا تھا۔فرحان بیگ کی خوشی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ زمین سے اپنے تعلق کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔

شام کو گاؤں کے کچھ لوگ آفتاب سے ملنے گھر آئے ہوئے تھے۔چائے کا دور چل رہا تھا۔دورانِ گفتگو گاؤں کے سرپنچ عبدالرحیم نے پوچھا ''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم کوئی بہت بڑے ڈاکٹر بن کر آؤ گے۔بیٹا میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا ہوں کہ آخر تم نے پڑھائی کون سی کی ہے؟'' آفتاب سے پہلے فرحان بیگ نے جواب دیا۔

''یہ ڈاکٹر تو بنا ہے لیکن مٹی کا ڈاکٹر ہے!'' سبھی آفتاب کی جانب حیرانی سے دیکھنے لگے۔آفتاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چاچا... میں Pedologist بن کر آیا ہوں جس کا مطلب ہوتا ہے مٹی کا علم رکھنے والا۔Pedology کو اردو میں طینیات کہتے ہیں۔یعنی مٹی کا علم۔'' میری بات سن کر

سرپنچ چاچا نے کہا۔

”ارے واہ... میں تو صرف یہی جانتا تھا کہ انسانوں کے ڈاکٹر ہوتے ہیں اور جانوروں کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ آج معلوم ہوا کہ مٹی کے بھی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔کل گاؤں کے پنچایت ہاؤس میں ایک پرگرام رکھتے ہیں۔ جہاں تم گاؤں والوں کو زمین اور مٹی کے تعلق سے معلومات دینا۔ تاکہ ہمیں بھی اپنے کھیتوں کی مٹی کے بارے میں اور زیادہ معلومات حاصل ہوں۔“ دادا جی فوراً بولے۔

”سائنسی معلومات...“ سبھی ہنسنے لگے۔

سرپنچ کا پوتا یاسین بھی آفتاب سے ملنے آیا تھا۔اس نے آہستہ سے اپنے دادا جی سے کہا۔

”دادا جی اگر آپ اجازت دیں تو ہم سب بچے بھی بھیا سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔“ سرپنچ جی نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا کل ہم لوگوں کو بات کر لینے دو پھر آپ لوگ اپنی کلاس لگانا۔“ یاسین نے کہا۔

”مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ لوگ کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔اتوار کو علی چاچا کے کھیت میں صبح ٹھیک سات بجے اپنی کلاس کیسی رہے گی...!“

”جی... علی دادا کے کھیت میں جو درخت نرسری (Green House) ہے اس میں...؟ واہ بہت اچھی جگہ ہے۔ بہت مزہ آئے گا، لیکن علی دادا سے اجازت لینا ہوگی۔“ یاسین نے علی دادا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔سرپنچ تمھارے پوتے کی یہ عادت مجھے بہت پسند ہے کہ وہ جب بھی دوستوں کے ساتھ نرسری (Green House) میں کھیلنے کے لیے آتا ہے تو پہلے اجازت ضرور لیتا ہے۔“ سرپنچ جی نے اپنے پوتے کی طرف فخریہ انداز میں دیکھا اور اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

اگلے دن آفتاب نے گاؤں والوں کے سوالات کے تسلی بخش جواب دیے اور پھر اتوار کا انتظار کرنے لگا۔ آفتاب نے خاص طور پر اتوار کا دن اس لیے طے کیا تھا تاکہ بچوں کو اسکول سے چھٹی کا بہانہ نہ مل جائے، دوسرے یہ کہ بچے اپنے ذہن میں کچھ سوالات بھی تیار کرلیں۔ جسے پوری امید تھی کہ یہ آج کے بچے ہیں کچھ اچھے سوالات تو وہ ضرور پوچھیں گے۔

جب بھی آفتاب گاؤں میں کسی کام سے گھر سے باہر نکلتا تو بچے اسے یاد دلاتے کہ بھیا ہم سب اتوار کو صبح علی دادا کے کھیت پر نرسری (Green House) میں ملنے والے ہیں اور وہ مسکرا کر ہاں کہتا۔

آفتاب جب مقررہ وقت پر علی چاچا کے کھیت پر پہنچا تو دیکھا بچوں کی ٹولی کاغذ قلم کے ساتھ پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہیں۔ بچے بہت خوش نظر آرہے تھے۔ وہ بھی پاس پہنچ گیا۔ وہاں مختلف عمر کے 15 بچے موجود تھے۔ وقت ضائع نہ کرتے ہوئے آفتاب نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

”ہاں تو شروع کریں۔ پوچھیے آپ لوگ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں۔“ یاسین نے پہلا سوال کیا۔

”بھیا... یہ مٹی کیسے بنتی ہے؟“

”آپ لوگوں کے لیے ابھی یہ جاننا کافی ہے کہ ہماری زمین پر بڑی بڑی چٹانیں ہیں۔ جن میں ٹوٹ

پھوٹ کا سلسلہ لگاتار جاری رہتا ہے جسے عمل فرسودگی (Weathering) کہتے ہیں۔ یہ عمل بہت سست رفتار سے ہوتا ہے۔ ہزاروں سال چٹانوں کی سطحوں پر قدرتی عناصر کا عمل جاری رہتا ہے۔ان چٹاوں کومٹی میں تبدیل ہونے میں بہت سال لگے ہیں۔'' آفتاب نے اپنی بات مکمل کی تو ندیم نے پوچھا۔

''بھیا...اسکول میں سر نے بتایا تھا کہ مٹی میں تراب (Humus) سب سے اہم ہوتا ہے،تو بھیا یہ تراب کہاں ملتا ہے، کیسے بنتا ہے اور یہ مٹی میں کہاں سے آتا ہے؟ کیونکہ سر نے بتایا تھا کہ یہ مٹی میں ہی ہوتا ہے۔آپ بتائیے جب ہم نے ڈالا نہیں تو ہماری زمین میں آیا کہاں سے...؟'' آفتاب نے ندیم سے پوچھا۔

''آپ نے اپنے سر سے یہ سوال کیوں نہیں پوچھا؟'' ندیم نے بڑا سا منھ بنا کر بتایا۔

''بھیا... پوچھا تھا مگر سر نے ڈانٹ دیا... پھر دوبارہ میں نے پوچھا نہیں۔''

''کوئی بات نہیں، آج میں تفصیل سے آپ کو بتاتا ہوں۔ سر نے صحیح کہا تھا کہ تراب کو کہیں سے لانے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ مٹی میں ہی موجود ہوتا ہے۔ زمین کے اوپر کی تہہ جو سڑے گلے مادے سے بنی ہوتی ہے، وہی تراب کہلاتی ہے۔ اچھا میں ایک دوسری طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مٹی میں درخت اور پودے اگتے ہیں، اسی زمین میں کچھ جانور بھی رہتے ہیں۔ جب پیڑ پودے اور جانور مر جاتے ہیں تو یہ آہستہ آہستہ گل سڑ کر مٹی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مٹی میں دبے ہوئے جانور اور پودوں کے گلنے سڑنے سے جو مادہ بنتا ہے وہی تراب کہلاتا ہے۔ بات سمجھ میں آئی...؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''جی بھیا...'' سب بچوں نے ایک ساتھ کہا، لیکن ندیم ابھی کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا۔

''بھیا تراب میں ایسا کیا ہے جو یہ مٹی کے لیے اتنا اہم ہوتا ہے؟''

''تراب عموماً گہرے رنگ کا بھورا (Brown) نامیاتی مادہ ہے جو مٹی میں نمی کو بنائے رکھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ اس میں مختلف معدنیات جیسے نائٹروجن، فاسفورس، پوٹاشیم، کیلشیم وغیرہ وافر مقدار میں موجود رہتے ہیں۔ جو پودوں کی صحت کے لیے ضروری ہیں۔'' ابھی آفتاب سانس لینے کے لیے رکا ہی تھا کہ بہت دیر سے خاموش بیٹھے اکبر نے پوچھا۔

''بھیا... مٹی کی کتنی تہیں ہوتی ہیں؟'' یاسین نے اکبر کی ہنسی اڑاتے ہوئے کہا۔

''بدھو... مٹی تو مٹی ہوتی ہے۔ جتنا بھی کھودو مٹی ہی نکلتی ہے۔'' سارے بچے ہنسنے لگے۔ آفتاب نے بچوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا ''اکبر... شاباش، آپ نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ آپ مٹی کی تہوں (Layers of Soil) کے بارے میں جاننا چاہتے ہو اور بچو! عام طور پر مٹی کی پانچ تہیں ہوتی ہیں۔ ہر تہہ میں مٹی کا رنگ بھی الگ ہوتا ہے۔'' آفتاب کا جواب سن کر بچوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے مگر اکبر کے چہرے پر سکون تھا کہ اس نے کوئی بے وقوفی بھرا سوال نہیں کیا تھا۔ آفتاب نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''پہلی ہے O Horizon یا نامیاتی (9Organic)، دوسری ہے A Horizon یا بالائی مٹی (Topsoil)، تیسری ہے B Horizon یا مٹی

کی زیریں سطح (Subsoil)، چوتھی ہے C Horizon یا Regolith، کسی سیارے کی سطح زمین پر چڑھا ہوا ٹھوس بھربھرا مادہ یا خاک)، اور ہاں اسے بنیادی سامان (Parent Material)، اور ہندی میں 'سامگری' بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ تہہ ہے جہاں مٹی بننے کا عمل ہوتا ہے اور سب سے نچلی تہہ کو R Horizon یا Bedrock)، دریائی مٹی کے میدانوں کی تہہ میں واقع چٹانیں) کہتے ہیں۔'' آفتاب نے اپنی بات پوری کی تو حمید نے جلدی سے کہا۔

''بھیا... پودے تو ہم سب سے اوپر والی تہہ میں لگاتے ہیں اس کا مطلب کہ O Horizon میں ہم پودے لگاتے ہیں...'' آفتاب نے کہا۔

''نہیں حمید... O Horizon یا (Organic) نامیاتی مٹی صرف اور صرف جنگلوں میں ہوتی ہے۔ یہ جو علی چاچا کے کھیت کی مٹی ہے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں یہ Horizon A یعنی (Topsoil) مٹی کی سطح کے اوپر کی تہہ ہے۔ یہی اوپری تہہ چھوٹے چھوٹے پودوں کی جڑوں کو قابو میں رکھتی ہے۔ دیکھیے یہ مٹی عموماً ریتیلی ہوتی ہے۔ اس میں بڑی مقدار میں تراب پایا جاتا ہے۔'' دانش جو ابھی چھٹی جماعت میں پڑھتا ہے اس نے سوال کیا:

''بھیا... یہ اتنے سارے Horizon کا کیا مطلب ہے؟'' آفتاب نے دانش کو اپنے پاس بلایا اور کاغذ پر کچھ کھڑی اور کچھ آڑی لائن کھینچ کر دکھاتے ہوئے کہا:

''آپ نے اسکول میں عمودی (Verticle) اور متوازی (Horizontal) لکیروں کے بارے میں پڑھا ہے نا... اسی Horizontal سے Horizon ہے کیونکہ جب ہم مٹی کو عمودی سمت میں کھودتے ہیں تو آپ کو مٹی کی الگ الگ رنگ کی تہیں نظر آئیں گی۔''

''جی بھیا... جب گاؤں میں کنواں کھودا جا رہا تھا تب رنگ برنگی تہیں میں نے بھی دیکھی ہیں اور بھیا... جیسے جیسے گہرائی میں کھدائی ہوتی گئی تو مٹی کا رنگ بھی بدلتا گیا۔ پہلے براؤن پھر پیلی پیلی مٹی کا ڈھیر لگ گیا تھا۔''

''جی ذاکر، آپ نے بالکل درست کہا۔ پہلی تہہ یعنی Topsoil صرف 0 سے 15 سینٹی میٹر تک پائی جاتی ہے۔'' آفتاب نے بات کی مزید وضاحت کی۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مٹی میں عام طور پر کیا کیا ہوتا ہے؟'' دانش نے پوچھا۔

''آپ مٹی کے اجزا_(Components of Soil کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ مٹی میں عام طور پر 25 فیصد پانی، 25 فیصد ہوا، 5 فیصد نامیاتی مادہ (Organic

(Material اور 45 فیصد معدنی اجزا (Mineral Components) ہوتے ہیں۔ جیسے ریت، کلے وغیرہ'' آفتاب نے رک کر چاروں طرف دیکھا۔ اب چمکدار دھوپ نکل آئی تھی۔ گرمی بھی بڑھتی جارہی تھی لیکن بچوں کے سوال ختم نہیں ہوئے تھے۔ یاسین نے پوچھا۔

''بھیا... ہماری زندگی کے لیے سب سے زیادہ اہم کیا چیز ہے؟''

''ہوا، پانی، سورج اور مٹی۔ انھیں زندگی کے لیے ضروری عناصر (Necessary elements for Life) کہا جاتا ہے۔ مٹی سے ہم سب کی زندگی جڑی ہے۔ چاہے انسان ہو یا جانور یا پھر پیڑ پودے۔ ہر جاندار کو مٹی کی ضرورت ہے۔ زرخیز مٹی کو پانی، ہوا اور سورج کی روشنی بھی چاہیے۔ کیا سمجھے؟ ان میں سے کوئی ایک بھی چیز کم ہو تو زندگی مشکل ہے۔'' اس سے پہلے کہ بچے کچھ اور سوال کرتے آفتاب نے کہا آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ اگلی کلاس اگلے ہفتے رکھیں گے۔ بچوں نے ہاں میں سر ہلایا اور پھر علی دادا کے کھیت کے پمپ کی جانب دوڑ گئے جہاں پانی کی تیز دھار ان کا انتظار کر رہی تھی۔ آفتاب بھی اپنے کھیت کی جانب چل دیا جہاں اس کے دادا سب کو ہدایات دے رہے تھے۔ دور سے آفتاب کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا۔

''اگلی کلاس کب ہے؟ میں بھی آؤں گا سر جی...''

اور دادا جی کی ہنسی کھیتوں میں چاروں طرف پھیل گئی۔

■

Shahtaj Khan
588/2b, Hayat Manzil, Plot No: 40
Flat No: 04, New Era Society, Market Yard
Pune - 411037 (Maharashtra)
shahtaj786@gmail.com

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... تاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC: CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in , فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159

دستخط

کہانی

محمد گلزار عالم

میلہ

تین بھنوں کی اولاد میں سب سے زیادہ محبت اقبال حسن کو اپنی اکلوتی بھانجی عنایہ سے تھی۔ بچوں سے وہ بے انتہا محبت کرتا تھا۔ جب بھی اسکول میں چھٹی ہوتی یا فراغت کا کوئی ایسا موقع ہاتھ لگتا، حماد اور عنایہ کو وہ گھر لے آتا۔ بچوں کے ساتھ وقت گزارنا اور ان کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کر کے اسے خوشی ملتی تھی۔

اولاد کی نعمت سے محروم بھانجوں اور اکلوتی بھانجی سے حد درجہ محبت کرنے والا اقبال دیر شام کام سے تھکا ماندہ گھر لوٹا تو عنایہ اس سے لپٹ گئی۔ نرم اور گداز ہاتھوں سے ماموں کی پیشانی پر نمودار پسینہ پوچھتے ہوئے بولی۔

'مجھے میلہ جانا ہے ماموں۔'

اس کے سفید اور روئی جیسے نرم گالوں پر بوسہ لیتے ہوئے اقبال نے کہا۔

'میری گڑیا کو میلہ دیکھنے جانا ہے۔ ہاتھ منھ دھو کر چائے پی لیتا ہوں۔ تب تک تم بھائی بہن تیار ہو جاؤ۔'

ماموں کی بات سن کر وہ دوڑتی ہوئی پہلے بھائی کے پاس پہنچی جو کھلونے والی بندوق سے مامی پر نشانہ تانے کھڑا تھا۔

'بھائی۔ بھائی۔ ماموں میلہ لے جائیں گے'

میلہ جانے کی خبر سن کر 4 سالہ حماد اپنا شکار آئندہ کے لیے چھوڑ کر بہن کے ساتھ امی کے پاس پہنچا۔

'امی! ہمیں تیار کر دیں۔ بڑے ماموں ہم دونوں کو میلہ دکھانے لے جانے والے ہیں'

گنجان آبادی میں صرف ایک بڑا سا میدان باقی بچا تھا، جس میں سال کے 2 بڑے تہواروں کے موقعے پر میلہ لگایا جاتا تھا۔ مختلف طرح کے جھولوں اور چکری کے ساتھ ٹوائے ٹرین اور رنگ برنگ کے کھلونے سے پورا میدان بھرا ہوتا ہے۔ 7 سے 10 دنوں تک کافی چہل پہل ہوتی ہے۔ بچوں کو ملنے والی عیدی اسی میلے میں ختم ہو جایا کرتی یا یوں کہا جائے کہ میلے والے بچوں کی عیدی اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتے۔

چائے سے فارغ ہو کر اقبال بھی تیار ہوا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف 40 روپے تھے۔ بیوی کی جانب حسرت بھری نگاہ ڈالی۔

زبیدہ شوہر کی پریشانی بھانپ چکی تھی۔ بڑی مایوسی کے ساتھ بولی۔

'وہی 100 روپے کا ایک نوٹ کافی دنوں سے بچا کر رکھی تھی وہ روپے بھی آپ کو دے چکی ہوں۔'

'ہاں! 60 روپے کی میڈیکل سے دوا لایا تھا۔ 40 روپے بچے ہیں۔'

اتنے کم پیسوں میں بچوں کو میلہ گھمانے لے جانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ لاڈلی بھانجی

سے وعدہ کر چکا تھا۔ ابھی اسی پیچ وخم سے وہ گزر رہا تھا کہ دونوں بچے تیار ہو کر اس کے کمرے میں آ دھمکے۔

'ہم تیار ہیں ماموں۔'

ڈھائی سالہ عنایہ کو گود میں اٹھایا اور حماد کا ہاتھ پکڑ کر راستے بھر حساب لگاتا رہا۔

20 روپے میں بچوں کو آئس کریم کھلا دوں گا بقیہ کے 20 روپے سے بچوں کو کھلونے دلا دوں گا۔ نہیں نہیں۔ بچوں کے پاس تو کھلونے ڈھیر سارے ہیں۔ بچے ہوئے پیسوں سے انھیں چکری یا ٹوائے ٹرین میں گھما دوں گا تا کہ بچے میلے کا لطف اٹھا سکیں۔ میلے میں کھانے پینے سے زیادہ چکری، جھولا و دیگر چیزوں میں چڑھنے کا ہی شوق بچوں کے اندر ہوتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بچے کسی اور چیز کی خواہش کریں تو کیا کروں گا۔ اس نے دل میں سوچا نہیں بیس روپے بچا کر رکھوں گا۔ معلوم نہیں کیا لینے کی ضد کریں۔ بچے ہی تو ہیں۔ ابھی سمجھداری کہاں ان میں۔

جمع وخرچ کا حساب لگاتا جوں ہی وہ میلے کے داخلی دروازے پر پہنچا، اندر کا نظارہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اب تک جو قدم بڑی آسانی کے ساتھ اٹھتے ہوئے میلے کی طرف بڑھے تھے اب وہی قدم اٹھانا اقبال کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ تھوڑا اٹھٹکا۔ اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جائے یا نہیں پیچھے سے ایک ہجوم کا دھکا لگا اور غیر اختیاری طور پر وہ میلے کے اندر داخل ہو گیا۔ بچوں کی جانب دیکھا تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ میلے میں رنگ برنگ قمقموں سے سجی مختلف سواریاں بچوں کو اپنی جانب ملتفت کر رہی تھی۔ بچے اپنے والدین کا ہاتھ پکڑے کبھی گھڑ سواری کی جانب کھینچ رہے تھے تو کبھی جھولے کی جانب۔ ابھی اندر کے منظر کا بغور جائزہ جاری ہی تھا کہ دونوں بچے ایک ساتھ بول پڑے۔

'ماموں! بڑی چکری میں بیٹھنا ہے'

'بڑی چکری بڑوں کے لیے ہے، بچے اس میں نہیں بیٹھتے۔'

'ٹھیک ہے تو پھر اس جھولے میں ہم لوگوں کو بیٹھنا ہے'

جھولا ہوا میں بہت اچھلتا ہے۔ بچوں کے گر جانے کا ڈر رہتا ہے۔' اقبال نے دانیہ کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

دراصل وہ ایسی سواری کی تلاش میں تھا جو کم قیمت میں بچوں کو تفریح کا سامان مہیا کرا دے۔ چلتے چلتے اس کی نظر ٹیکسی نما جھولے پر پڑی۔ ایک بچہ کے لیے 10 روپے ریٹ چارٹ لگا ہوا نظر آیا۔ ریٹ چارٹ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ اس نے سوچا بچے تھک گئے ہوں گے پہلے انھیں آئس کریم کھلا دوں۔ اس کے بعد چکری کی سیر کرا دوں گا۔ دو آئس کریم لے کر بچوں کی جانب بڑھایا۔ آئس کریم دیکھ کر بچے خوشی سے اچھل پڑے۔ آئس کریم کی آخری چسکی لیتے ہوئے عنایہ بول پڑی۔

'ماموں! ٹیکسی''

'ہاں! ہاں پہلے آئس کریم ختم کر لو۔

20 روپے بچے تھے۔ ٹیکسی والی چکری کے پاس آ کر اس نے آخری پونجی جیب سے نکال کر چکری چلانے والے کے ہاتھ میں تھمایا اور دونوں بچوں کو اس پر بٹھا کر چکر کی گنتی میں مصروف ہو گیا۔ جہاں ایک طرف خالی جیب کا دکھ تھا وہیں دوسری جانب بچوں کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی روحانی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ 6 چکر کے ساتھ بیس

روپے کا رچارج ختم ہوا۔ چکری سے اتر کر دونوں بچوں نے ماموں کا ہاتھ پکڑا۔ عنایہ کو اس نے گود میں لیا اور حماد کا ہاتھ تھامے وہ میلے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ عنایہ کی نظر ٹوائے ٹرین پر پڑ گئی۔

'ماموں! ریل گاڑی'۔ عنایہ زور سے چلائی اور ماموں کا چہرہ اپنے نرم ہاتھوں سے اس جانب گھماتے ہوئے انھیں دکھانے کی کوشش کرنے لگی۔

اقبال کا پسینہ چھوٹنے لگا۔ جیب بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ٹوائے ٹرین میں بیٹھنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ ادھر دونوں بچے ضد پر اڑ گئے۔ اس نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ بچوں کو بہلانے اور پھسلانے کے لیے ایک بار پھر میلے کا چکر لگایا تاکہ وہ ٹوائے ٹرین کی سواری کرنے والی بات بھول جائیں۔ لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔ ان کی سوئی ٹوائے ٹرین پر آکر اٹکی ہوئی تھی۔ اقبال نے دوبارہ میلے سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن عنایہ کے آنسوؤں نے اسے اندر جانے پر مجبور کر دیا۔

وہ بچوں کی خواہش کے سامنے بے بس اور لاچار ہو چکا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بڑی ہمت کر کے بچوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کل دوبارہ میلہ گھومنے آئیں گے اور ٹوائے ٹرین کا سفر کریں گے، لیکن بچے ماننے والے کہاں تھے۔

'نئ (نہیں) تو! آج بیٹھنا ہے تو آج' عنایہ ماموں کے کاندھے پر ہاتھ ڈال کر بولی۔

اقبال مارے شرم کے زمین میں دھنسا جا رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بچوں کو کس طرح سمجھائے کہ اس کی جیب خالی ہے اور ٹوائے ٹرین میں بیٹھنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ خالی جیب کے ساتھ بچوں کی خواہش کس طرح پوری کرے۔

بے بسی، کمتری، لاچاری اور کم مائیگی کے احساس کے ساتھ اس نے نم آنکھوں سے آسمان کی جانب دیکھا۔ گویا وہ اپنے پروردگار سے مخاطب تھا۔

''دیکھ تیرا بندہ کس قدر مجبور ہے۔ میں سمجھانے کے قابل نہیں، دلوں پر تیری حکمرانی ہے۔ اب تو ہی ان بچوں کے دل کو آج کی ضد سے پاک کر دے۔'

آنسو کے دو قطرے موتی کی طرح اس کے گال پر چمکنے لگے۔ انسان کبھی کبھی اس قدر بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنوں کی خواہش پوری کرنے کے لائق نہیں رہتا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے حماد سے آہستہ سے کہا۔

'بابو! میرے پاس اب پیسے نہیں ہیں۔ کل کام کرنے جاؤں گا تو پیسے ملیں گے۔ کل پھر ہم لوگ میلہ آئیں گے۔'

اقبال کی بے بسی پر عرش والے کو شاید رحم آگیا اور نہ جانے حماد میں اتنی سمجھداری کہاں سے آگئی کہ ضد کرتی عنایہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

'ہم لوگ کل ٹرین میں بیٹھیں گے۔'

عنایہ بھی خاموش ہوگئی اور دونوں بچے ماموں کا ہاتھ پکڑے بڑی خاموشی کے ساتھ میلے سے باہر نکل گئے۔

■

Md. Gulzar Alam
Rail Par, K.T. Road
Jahangiri Mohalla, Asansol
Distt.: Paschim Burdwan- 713302 (WB)
Mob.: 9563742626
gulzar.connect@gmail.com

حمیرا عالیہ

سارس کی احسان مندی

Tsuru no Ongaeshi یعنی 'سارس کی احسان مندی' جاپانی لوک کتھاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک سارس کی کہانی ہے جو ایک آدمی کے احسان کا بدلہ اتارتی ہے۔ یہ کہانی کئی طریقوں سے بیان کی جاتی ہے۔ ایک کہانی کے مطابق آدمی ایک عورت سے شادی کرتا ہے جو دراصل انسان کے بھیس میں ایک سارس تھی۔ یہ کہانی Tsuru Nyobo یعنی 'سارس بیوی' کے نام سے مشہور ہے۔ جاپانی محقق سیکی کیگو کے مطابق یہ کہانی مافوق الفطرت اور جادوئی میاں بیوی کے بارے میں جاپان کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ایک ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک اور کہانی Kaisan Engi ہے۔ لیکن ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اس کہانی کے مرکزی کردار کنزو نے سارس کو کپڑا بنتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اپنی بیوی کے چلے جانے کے بعد کنزو ایک مونک بن گیا تھا۔ سارس کا چھوڑا ہوا آخری کپڑا کئی برسوں تک جاپان کے کنزو جی مندر میں رکھا رہا تھا۔ اس مندر کو اب شن زو جی مندر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سارس کی احسان مندی کی کہانی پورے جاپان میں مختلف طریقوں سے بیان کی جاتی ہے۔)

ایک بار کی بات ہے جاپان میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک سفید سارس پھڑ پھڑاتی ہوئی اس کے قدموں کے پاس آ کر گری۔ بیچاری سارس زخمی تھی اور اسے کسی شکاری نے مارا تھا۔ کسان نے دیکھا کہ اس کے ایک خوبصورت پنکھ میں تیر دھنسا ہوا ہے۔ اسے معصوم پرندے پر بے حد ترس آیا اور اس نے سارس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آہستگی سے سارس کے زخمی پنکھ سے تیر نکالا اور اس کے گھاؤ کو صاف کر کے پٹی باندھ دی۔ کسان کی رحم دلی اور دیکھ بھال کی وجہ سے سارس بہت جلد ٹھیک ہوگئی۔ آہستہ آہستہ وہ صحت مند

ہو کر اڑنے کے قابل ہو گئی۔ ایک صبح کسان نے اسے آسمان میں اڑا دیا اور بلند آواز سے کہا ”اپنا خیال رکھنا اور شکاریوں سے بچ کر رہنا۔“

یہ سن کر حسین سارس نے تشکر سے اپنی لمبی گردن ہلائی۔ پھر اس نے تین دفعہ کسان کے سر کے اوپر چکر لگایا اور اڑ گئی۔

شام ہونے والی تھی۔ کسان نے سوچا اسے گھر واپس جانا چاہیے۔ جب وہ گھر پہنچا تو ایک جادو ہوا۔ ایک خوبصورت لڑکی اس کے گھر میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کسان نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا:

”تمھارا استقبال ہے۔ میں تمہاری بیوی ہوں“

یہ سن کر کسان بہت حیران ہوا۔ اس نے کہا ”لیکن میں ایک غریب آدمی ہوں اور میں تمھارا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔“

”کوئی بات نہیں“ لڑکی نے کہا ”میرے پاس چاول کی ایک تھیلی ہے جس سے ہم دونوں اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں۔“

اس طرح وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس لڑکی کی جادوئی تھیلی سے چاول کبھی ختم نہیں ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ چاولوں سے بھری رہتی تھی۔

ایک دن لڑکی نے کہا ”مجھے کپڑا بننے کے لیے ایک کمرے کی ضرورت ہے۔ برائے مہربانی میرے لیے ایک کمرہ بنوا دو۔“

کسان نے اس کی خواہش کی تعمیل کی اور ایک کمرہ بنانا شروع کر دیا۔ جب کسان نے اس کا نیا کمرہ مکمل بنا دیا تو اس کی بیوی نے پھر کہا ”برائے مہربانی مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تک میرا کام ختم نہ ہو جائے تم اندر نہیں آؤ گے۔“

اس کے شوہر نے جواب دیا ”ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں میں تمھارے کمرے میں نہیں آؤں گا۔“

اس کے بعد وہ لڑکی کپڑا بننے کے لیے اندر چلی گئی۔ دراصل وہ غریب کسان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ وہ سات دنوں تک لگاتار کپڑا بنتی رہی اور بالآخر جب وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بے حد ریشمی کپڑے کا ٹکڑا تھا۔ اتنا خوبصورت اور ملائم کپڑا کسان نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس کی بیوی نے اسے کپڑا دیتے ہوئے کہا ”اسے بازار میں لے جاؤ اور اچھی قیمت پر بیچ دو“

کسان اس کپڑے کو لے کر شہر چلا گیا۔ وہاں کے بازار میں اس خوبصورت کپڑے کے عوض اسے بہت روپے ملے۔ وہ ہنسی خوشی گھر واپس آ گیا۔

کچھ دنوں بعد کسان کی بیوی نے پھر سے کمرے میں جاتے ہوئے کہا ”برائے مہربانی جب تک میرا کام ختم نہ ہو جائے تم اندر مت آنا۔“ اور سات دنوں بعد اس نے ایک بار پھر ویسا ہی خوبصورت اور ملائم کپڑا اسے بیچنے کے لیے دیا۔

آہستہ آہستہ کسان کے حالات بہتر ہونے لگے۔ اس کی بیوی ہر دفعہ بنائی کے کمرے میں جاتی اور سات دنوں تک کپڑا بنتی رہتی۔ وہ دن رات اس کے لیے سخت محنت کرتی۔ کسان اس قیمتی کپڑے کو شہر کے بازار میں مہنگے داموں میں بیچتا اور ہنسی خوشی واپس آتا۔ اب وہ اچھا خاصا امیر ہو چکا تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق اس کی بیوی نے پھر کہا

''میں کمرے میں جارہی ہوں۔ برائے مہربانی اندر مت آنا۔'' یہ کہہ کر وہ کپڑا بننے کے لیے اندر چلی گئی۔ کسان کے اندر کئی دنوں سے تجسس پل رہا تھا۔ اس نے سوچا ''مجھے کمرے کے اندر جاکر دیکھنا چاہیے کہ دھاگوں کے بغیر اس قدر خوبصورت کپڑا میری بیوی آخر کس طرح تیار کرتی ہے۔''

تجسس نے کسان کو بے چین کردیا اور وہ اپنا وعدہ بھول کر کمرے میں داخل ہوگیا۔

لیکن یہ کیا؟؟؟

اندر جاکر اس نے دیکھا وہاں کوئی لڑکی نہیں تھی بلکہ اس کے بجائے ایک خوبصورت سفید سارس چرخے کے پاس بیٹھی اپنے پروں سے کپڑا بن رہی تھی۔ وہ دھاگے کی جگہ اپنے ملائم پروں کا استعمال کرکے چرخہ کات رہی تھی۔ کسان کو یاد آیا یہ وہی سارس تھی جس کی اس نے مدد کی تھی۔

کسان کو دیکھ کر سارس چونک گئی۔ اس کا راز فاش ہوچکا تھا۔ اس نے کہا ''میں وہی سارس ہوں جس کی تم نے جان بچائی تھی۔ میں تمھاری رحمدلی اور مہربانی کا قرض اتارنا چاہتی تھی اس لیے میں تمھاری بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہنے لگی۔ لیکن اب جب کہ تم نے میری حقیقت جان لی ہے تو میں مزید یہاں نہیں رہ سکتی۔''

کسان حیرت زدہ تھا۔ سارس نے اسے آخری کپڑا دیتے ہوئے کہا ''یہ میں تمھارے پاس اپنی یادگار چھوڑ کر جارہی ہوں۔ خدا حافظ''

یہ کہہ کر سارس نے ایک الوداعی نظر کسان پر ڈالی اور آسمان میں اڑکر ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد وہ سارس کسان کے پاس کبھی نہیں لوٹی۔ کسان اپنی وعدہ خلافی پر بے حد افسردہ ہوا لیکن اب پچھتانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ احسان، مہربانی اور مدد کا بدلہ چکایا جاسکتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ اپنی موجودہ حالت پر شکرگزار رہنا چاہیے اور وعدہ خلافی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔

(مرکزی خیال جاپانی لوک کتھا سے ماخوذ)

■

Humaira Alia
Research Scholar, Department of Urdu
Lucknow University
Nadwa Campus, Tagore Marg
Lucknow - 226007 (UP)
Mob.: 9140807085
humaira7.ha@gmail.com

جواب

1	Vint Carf	2	21 مئی 1904	3	13 جولائی 1930	4	وٹامن ڈی
5	ہمت	6	Congo	7	بحر ہند	8	Femur
9	سعادت حسن منٹو	10	برج خلیفہ	11	ہکی بنگال گزٹ	12	ویلینٹینا ٹیریشکوا
13	سائبیریا، روس	14	Compact Disc	15	کبوتر	16	انڈیا
17	ولیم شیکسپیئر	18	پوٹاش	19	Geoffrey Chaucer	20	سات

مصنف: گیلینا لیبی دیوا
مترجم: محمد اسداللہ

ماشا کا بستر

(روسی کہانی)

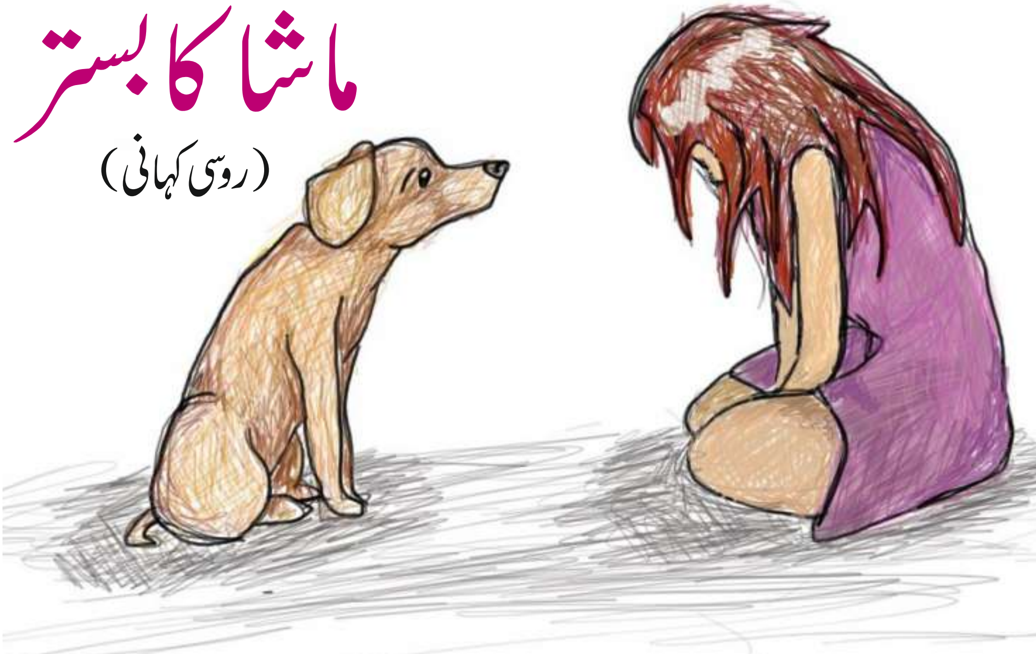

رات جب بہت دیر ہوگئی تو ماشا کی امی نے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ رضائی اڑھا دی اور کمرے کی لائٹ آف کر کے خود بھی سونے چلی گئیں۔ ماشا نے کچھ دیر تک سونے کی کوشش کی مگر نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بستر سخت کھردرا اور ذرا بھی آرام دہ نہیں تھا۔تکیہ بھی خوب موٹا اور سخت تھا۔ ماشا کو ان سب چیزوں پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے تکیے کو دو چار گھونسے جڑ دے اور بڑ بڑانے لگی، ’موٹو کہیں کے! کتنے گرم اور سخت ہو تم‘ پھر اس نے لات مار کر رضائی کو بستر سے نیچے گرا دیا۔ پھر وہ بڑبڑاتی ہوئی نیچے اتری۔ ’نہیں سونا ہے مجھے اس سڑے بستر پر۔‘ ماشا نے بستر سے اتر کر چپل پہنی اور پیر پٹختی ہوئی باہر جانے لگی۔ اس کی امی سو چکی تھیں۔تھوڑی دیر وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی، پھر سیڑھیوں سے اتر کر باہر آ گئی۔اس نے دل ہی دل میں کہا۔’جاگنے میں کتنا مزہ آتا ہے نا؟‘

ماشا آنگن میں آئی تو اسے اپنی کتیا ’توائیکا‘ کی غراہٹ سنائی دی۔’یہ کون ہے؟‘

’میں ہوں ماشا‘

’تم ابھی تک سوئی نہیں، کتنی رات ہوگئی ہے؟‘

’نہیں سونا ہے اس سڑے بستر پر، مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے، میں اس پر کبھی نہیں سوؤں گی۔‘ ماشا نے کہا۔

’تم ٹھیک کہتی ہو،سونے کے لیے کسی کتے کے نرم بستر سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے، اس جگہ بڑے اچھے اچھے خواب آتے ہیں۔آؤ اندر آ کر سو جاؤ۔ توائیکا نے کہا۔

’اچھا‘، یہ کہہ کر ماشا اس کتیا کے گھر میں داخل ہوئی اور اندر جا کر سونے کی کوشش کی مگر وہ جگہ بہت تنگ تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا اسی وقت توائیکا نے اس کی طرف ایک ہڈی بڑھائی۔’اسے چوسو بڑا مزہ آئے گا۔‘

مگر ماشا کو وہ جگہ پسند نہ آئی اور وہ جلد ہی 'شکریہ' کہہ کر وہاں سے رینگتی ہوئی باہر آ گئی۔

'پتہ نہیں اسے کون سے عالیشان ٹھکانے کی تلاش ہے؟' تو ائیکا ناراضی سے بڑبڑائی۔

اس کے بعد ماشا مرغی کے ڈربے کی طرف چل دی۔ مرغی کے ڈربے کا دروازہ کھولتے ہی مرغی اسے دیکھ کر چلاّئی۔

'کیا چاہیے تمھیں؟'

ماشا نے کہا، 'میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ کیا مرغی نے انڈے دے دیے ہیں؟'

'نہیں۔ ابھی تمھیں انتظار کرنا پڑے گا، جاؤ جا کر سو جاؤ، مرغی نے کہا۔

'میں نہیں سو سکتی'۔ ماشا نے اسے بتایا

'کیوں؟'

'میرا بستر بہت گرم، کھردرا اور سخت ہے۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے'۔

اچھا، ہاں، سونے کے لیے تو کوئی اچھی جگہ چاہیے۔ ہم مرغیاں سب ایک ساتھ سوتی ہیں، آؤ تم بھی ہمارے ساتھ سو جاؤ، ماشا بڑی مشکل سے اس ڈربے میں گھس پائی۔ دو مرغیوں کے بیچ اسے سمٹ کر بیٹھنا پڑا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی مگر جلد ہی وہ لڑھک گئی۔ شکر ہے اسے چوٹ نہیں آئی۔ وہ وہاں سے باہر نکل آئی اور آنگن ہی میں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد نہ جانے کہاں سے ایک عجیب وغریب قسم کا پرندہ اڑ کر وہاں آ گیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

'کون ہو تم؟'

'میں چمگادڑ ہوں۔ میں دن بھر چھت سے لٹک کر سوتا رہتا ہوں اور رات میں اڑتا ہوں۔ مگر تم یہاں کیوں جاگ رہی ہو؟'

'میرا بستر بالکل بھی اچھا اور آرام دہ نہیں ہے'۔

'ارے! کیا میں تمھاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟'

'ہاں'

'میرے پیچھے پیچھے اس چھت پر آؤ'۔

'چمگادڑ ایک چھوٹی سی کھڑکی کے ذریعے اس عمارت

کہانی

میں داخل ہوگئی۔ ماشا سیڑھی چڑھ کر اس کے پیچھے گئی۔

’یہ ہے میرا کمرہ‘۔ چمگادڑ نے کہا۔

’مگر تمھارا بستر کہاں ہے؟‘

’مجھے بستر کی کیا ضرورت؟‘ چمگادڑ نے ہنس کر کہا۔ میں سیدھے چھت پر جاتی ہوں اور کسی بھی کھونٹی یا کیلی سے لٹک جاتی ہوں۔ آؤ تم بھی! میں تمھیں ایک بڑی سی کھونٹی دکھاؤں۔

ماشا کو یاد آیا کہ وہ مرغی کے ڈربے میں کیسی مشکل سے بیٹھ پائی تھی۔ ’ارے میں الٹی کیسے لٹک سکتی ہوں؟ میں تو سر کے بل گر پڑوں گی اور یہ عمارت کتنی گندی ہے۔‘

’تب رہنے دو۔‘

ماشا نے کچھ نہیں کہا اور تیزی سے سیڑھی کو پھلانگ کر نیچے اتر گئی۔ پھر وہ باہر آئی اور تالاب کی طرف چل پڑی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر مینڈکوں نے ٹرّانا بند کر دیا اور چھلانگیں مارنے لگے۔ تالاب کے کنارے ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے ایک بوڑھے بگلے نے اپنے پر پھڑپھڑائے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی بچی کھڑی ہے۔

’اے لڑکی! اتنی رات گئے تم ادھر گھوم پھر کر مینڈکوں کو کیوں ڈرا رہی ہو؟‘

’مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔‘

یہ سن کر بگلے نے کھکارنے کی کوشش کی۔ ایسا لگتا تھا اسے سردی ہوگئی ہے۔ ’مجھے لگا مجھ بوڑھے ہی کو رات میں نیند نہیں آتی۔

یہاں ہر طرف نمی ہے نا اس لیے مجھے سردی ہوگئی ہے۔ مگر تمھیں کیا ہوا جو اتنی رات تک بھٹک رہی ہو؟‘

’کچھ نہیں‘ ماشا نے کہا، ’روز روز کیا بستر پر سونا، بور نہیں ہو جاؤں گی میں؟‘

’ہاں یہ بات تو ہے‘، کیا تم میرے پاس آؤ گی، آؤ ہم دونوں دوست بن جائیں۔ میں تمھیں کھانے کے لیے ایک مینڈک دوں گا۔ میرے پاس یہاں آ کر ایک پیر پر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمھارے اوپر اپنے پنکھ پھیلا دوں گا۔‘

’مجھے مینڈکوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں پانی میں بھیگ جاؤں گی۔ مجھے نہیں آنا ہے تمھارے گھر سونے کے لیے۔‘‘

’رونی صورت! چلی جاؤ یہاں سے، رو رو کر اس جگہ کو اور گیلا نہ کرو، پہلے ہی بہت پانی ہے یہاں۔

ماشا اپنے گھر کی طرف چل دی۔ اس نے سوچا، سونے کے لیے تالاب تو بڑی ٹھنڈی اور گیلی جگہ ہے۔ اس کے بجائے گرم بستر پر نرم لحاف میں لپٹ کر سونا کیا برا ہے اور تو اور وہ چبھتا بھی نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہے اور میرا تکیہ بھی کتنا نرم ہے۔

ماشا اپنے گھر پہنچی، اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ فرش پر پڑا لحاف اٹھایا، اپنے تکیے کو پیار سے تھپکی دی اور گرم بستر پر لیٹ گئی۔ پھر ایک لمبی جماہی لیتی ہوئی بڑبڑائی: مجھے نہیں لگتا، پوری دنیا میں میرے بستر سے اچھا کسی اور کا بستر ہوگا۔‘ اور پھر وہ سوگئی۔

(انگریزی سے ترجمہ)

■

Mohammad Asadullah
30, Gulsitan Colony
Near Pande Amrai Lawn
Nagpur- 440013 (Maharashtra)
zarnigar2006@gmail.com

قسط 10

جنگل کی کہانی

رمیش نارائن تیواری

مترجمہ

زینت شہریار

قسط وار ناول:

پیارے بچو! ہر عمر کے لوگوں کو قصے اور کہانی سننے کا شوق ہوتا ہے، خاص طور پر بچپن میں کہانیوں سے دلچسپی ہوتی ہے اورسبق آموز کہانیوں سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ اسی وجہ سے دادی، نانی اور امی وغیرہ سے کہانیاں سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ بچوں کی پسندیدہ چیزوں میں جنگل اور جنگلی جانور کافی اہمیت کے حامل ہیں، بچے ٹیلی ویژن پر بھی ایسے کارٹون اور کہانیاں شوق سے دیکھتے ہیں۔

'جنگل کی کہانی' رمیش نارائن تیواری کی عمدہ کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ زینت شہریار نے کیا ہے، بھیڑیا، شیر، بندر، اژدھا، موگلی اور فا وغیرہ اس کتاب میں بیس کہانیاں شامل ہیں جو آپس میں مربوط ہیں۔ بچوں کی دلچسپی اور پسندکے پیش نظر 'جنگل کی کہانی' کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے امید ہے کہ اسے آپ پسند کریں گے اور ان سے سبق بھی حاصل کریں گے۔

اب تک آپ بھیڑیا اور گیدڑ، شیر خاں کی دھمکی، بھیڑیا گروہ میں موگلی کا مطالعہ، شیر خاں کی سازش، لال پھول کا کرشمہ، موگلی جنگل سے انسانوں کی بستی میں، شیر خاں کا خاتمہ پڑھ چکے ہیں۔ 'انسانی سماج سے اخراج' میں بتا گیا ہے کہ موگلی نے جب شیرخان کو ماردیاتو بل دیو کو یقین نہیں ہواکہ ایک کمسن لڑکا اتنے بڑے اوربھادر شیر کاشکار کرسکتاہے۔بل دیو نے موگلی سے کہاکہ اس شیر کے مارنے پرسرکار مجھے سوروپے انعام دے گی تو میں تمھیں ایک روپیہ دے دوں گا۔یہ سن کر موگلی ناراض ہوگیااوراس نے اکیلابھیڑیاسے کہاکہ یہ مجھے پریشان کررھاہے اس لیے اس کی خبر لو۔ اکیلانے بل دیوپرحملہ کردیااوراسے زمین پرپٹک دیا۔بل دیوگائوں میں گیااوریہ شور کردیاکہ موگلی جادوٹوناجانتاہے اورجانوروں سے بات کرتاھے۔یہ سن کر گائوں والوں نے اسے گائوں سے نکال دیا۔ اب آگے (ادارہ)

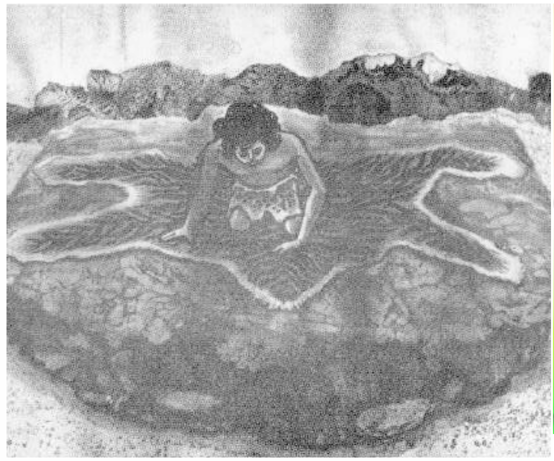

قسم پوری ہوئی

پہاڑی پر چڑھ کر موگلی اور بھیڑیے جس وقت اماں بھیڑیا کی غار کے سامنے پہنچے اس وقت چاند افق کی طرف اتر رہا تھا۔

''انھوں نے مجھے آدمی گروہ سے نکال باہر کیا، اماں''۔موگلی نے غار کے سامنے کھڑے ہوکر آواز لگائی۔ ''لیکن مجھے اپنا قول پورا کرنا تھا۔ میں شیر خاں کی کھال مجلس گاہ پر بچھانے کے لیے ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

اس کی آواز سن کر اماں بھیڑیا بڑی مشکل سے چلتی ہوئی غار کے باہر آئی۔کھال دیکھتے ہی اس کی آنکھ چمک اٹھیں۔

''میں نے اسی دن کہہ دیا تھا میرے ننھے مینڈک میں نے تو اسی دن کہہ دیا تھا جب وہ ہتھیارا قصائی میرے غار میں اپنا سر گھسائے تیری جان لینے پر آمادہ کھڑا تھا، اسی دن میں نے کہہ دیا تھا کہ شکار کرنے والا خود ہی شکار بن جائے گا۔''

''چھوٹے بھائی، یہ بہت اچھا ہوا'' پیچھے کی گھنی جھاڑیوں سے ایک بھاری آواز آئی۔ ''ہمیں تیرے بغیر بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔'' یہ کہتا ہوا بگھیرا دوڑ کر موگلی کے پاؤں پر لوٹ گیا۔ بھالو دادا کو خبر ملی تو وہ بھی اپنے انوکھے شاگرد سے ملنے دوڑا۔ سب لوگ مل کر مجلس گاہ پر چڑھ گئے۔ وہاں موگلی نے اس چکنی اور مسطح چٹان پر جس پر کبھی 'اکیلا' رہنما کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا، شیر خاں کی کھال بچھادی۔ پھر اس نے بانس کے چار کھونٹے مضبوطی سے کھال کے چاروں کونوں پر ٹھونک دیے۔اس بار پھر 'اکیلا' اس چٹان پر جا کر اطمینان سے لیٹ گیا اور پرانے دنوں کی طرح ایک بار پھر اس کی پکار مجلس گاہ سے اٹھ کر شبنی کی پہاڑیوں میں گونج گئی۔ ''دیکھ لو، بھیڑیو، ٹھیک سے دیکھ لو' اور اپنی فطرت کے مطابق گروہ کے سارے بھیڑیے مجلس گاہ پر آ کر جمع ہو گئے۔

شیر خاں کے مارے جانے کی خوشی میں موگلی بہت دیر تک سرور میں ناچتا اور گاتا رہا۔اس کا یہ گانا تھا تو بے تکا لیکن اس کے دل سے پھوٹ رہا تھا۔ گانا ختم ہوا تو موگلی کھڑا ہوگیا اور بولا'' بھیڑیو! تم نے دیکھا کہ میں نے شیر خاں کو مارنے کا جو قول دیا تھا وہ پورا ہوگیا ہے۔اب سنو، میں بھیڑیا گروہ اور انسان گروہ دونوں سے نکال دیا گیا ہوں۔ لہٰذا ارادہ ہے کہ اب میں اپنا شکار تنہا رہ کر ہی کروں گا۔''

''اور ہم لوگ بھی تیرے ساتھ شکار کریں گے۔'' اماں بھیڑیا کے چاروں بچے بولے۔اس دن سے موگلی اپنے چار بھیڑیا بھائیوں کے ساتھ جنگل میں سب سے الگ شکار کرنے لگا۔

■

ماخذ: جنگل کی کہانی: رمیش نارائن تیواری، **مترجمہ:** زینت شہریار
دوسری اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ادریس شاہجہانپوری

چاند کے داغوں میں انسانی رہائش کے امکانات

بچو! دادی ماں کی لوریوں میں تمھارے بزرگ اپنے بچپن میں چندا ماما دور کے...، چاند میں چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا اور چاند کے داغ وغیرہ کا ذکر سنا کرتے تھے۔ مگر یہ سب باتیں اب قصے کہانیوں کا حصہ بن چکی ہیں، جیسے جیسے سائنس نے ترقی کی اور انسان کے قدم چاند پر پہنچے تو چندا ماما دور کے... کی جگہ چاند کے راکٹ نے لے لی اور وہاں پہنچ کر جب انسان نے تحقیق یعنی ریسرچ کی تو معلوم ہوا کہ وہاں بڑے بڑے گڈھے اور غار ہیں جو ہمیں زمین سے داغ دھبوں کی شکل میں دکھائی دیتے تھے۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں حال ہی میں ایک نئی دریافت ہوئی ہے وہ یہ کہ وہاں لگ بھگ 100 میٹر گہرے غار کا پتہ چلا ہے جس کے بارے میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مستقبل میں اس غار کو آدمیوں کے رہنے کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔ سائنس دانوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ چاند پر ایسے ہی بے شمار غار ہوسکتے ہیں۔

18 مئی 1991 کو چاند پر جانے والی برطانیہ کی پہلی خلا باز خاتون ہیلن شرمن (Helen Sharman) نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نئے دریافت کیے گئے غار میں انسانی آبادی کے بسنے کے اچھے امکانات موجود ہوسکتے ہیں۔ بچو! ہیلن شرمن نے خلا میں 7 دن، 21 گھنٹے اور 13 منٹ گزارے تھے۔

تو چلو ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ چاند کی زمین کے نیچے یہ غار اتنا گہرا ہے کہ خلابازوں کو اس سے باہر آنے کے لیے لفٹ یا جیٹ پیک کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ گڈھا چاند پر لاوا کے ذریعے بنے ہوئے ایک میدان میں پایا گیا ہے جہاں تقریباً پچاس سال قبل اپولو 11 سے خلائی سفر کرنے والے نیل آرم اسٹرانگ (Neil Armstrong) اور بز آلڈرن (Buzz Aldrin) نے پہلی بار قدم رکھا تھا۔ اس گڈھے کو میئر ٹرینکولیٹیس پٹ (Mare Tranquillitatis Pit) کا نام دیا گیا ہے۔ ناسا کے لونر ریکا نیساں آربٹر (Luner Reconnaissance Orbiter) یعنی ایل آر و نے اپنے رڈار سے جو معلومات اکٹھا کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میئر ٹرینکولی ٹے ٹیس پٹ، چاند پر سب سے گہرا گڈھا ہے جو 45 میٹر چوڑے اور 80 میٹر لمبے غار کی طرف جاتا ہے، تم یہ سمجھو کہ اس کی لمبائی اور چوڑائی 14 ٹینس کورٹس کے برابر ہے اور یہ غار چاند کی سطح سے تقریباً 150 میٹر نیچے واقع ہے۔ اٹلی میں ٹرنٹو یونیورسٹی کے لورنزو بروزن (Lorenzo Bruzzone) اور لیونارڈو کیررا (Leonardo Carrera) نے اس غار

غار میں چاند کی اوپری سطح پر ایک روشن دان جیسا دہانہ بھی ہے جس کے ذریعے اس غار تک پہنچا جاسکتا ہے۔ تصویر: ناسا بشکریہ دی گارجین ڈاٹ کام

کو اس وقت تلاش کیا جب انھوں نے رڈار کی مدد سے اس سوراخ میں گھسنے کی کوشش کی۔

تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ غار کسی زمانے میں ایک سمندر رہا ہوگا جو ایک گڈھے کی شکل میں زمین سے بھی نظر آتا ہے۔سائنسدانوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ یہ غار اربوں سال پہلے بہنے والے لاوا کی وجہ سے بنا ہوگا۔لیونزآر بٹرس نے ایک دہائی سے زیادہ قبل پہلی بار چاند پر گڈھے دریافت کیے تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ 'اسکائی لائٹس' ہیں جو زیر زمین غاروں سے جڑتی ہیں۔ چاند کی سطح کے نیچے یہ بڑی بڑی سرنگیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے بنتی ہیں۔ پروفیسر کیررا نے اس کی مثال اسپین میں موجود لاوے سے بننے والے غاروں سے دی ہے۔ ایک بار جب اس بہت بڑے غار کی دریافت ہوگئی ہے تو اس کو انسانی آبادی کا ٹھکانہ بنانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہماری پیاری زمین پر بھی تو زندگی کی شروعات غاروں سے ہی ہوئی تھی۔حالانکہ ابھی اس غار کے بارے میں ریسرچ یعنی تحقیق پوری نہیں ہوئی ہے مگر امید ہے رڈار، کیمرے یا روبوٹ کی مدد سے اس کی تفصیلات حاصل ہوجائیں گی۔

بچو! ہم تمھیں بتادیں کہ اب سے تقریباً 50 سال پہلے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ چاند کی سطح پر غار ہوں گے۔ پھر 2010 میں ایل آر او نامی مشن کے دوران کیمرے نے وہاں موجود چند گڈھوں کی تصویریں لی تھیں۔اب تک چاند پر کم ازکم 200 گڈھے دیکھے گئے ہیں اور ان میں سے بہت سے لاوے کے میدانوں میں پائے گئے ہیں جو کہ زیر زمین لاوا ٹیوبوں کے داخلی راستے ہو سکتے

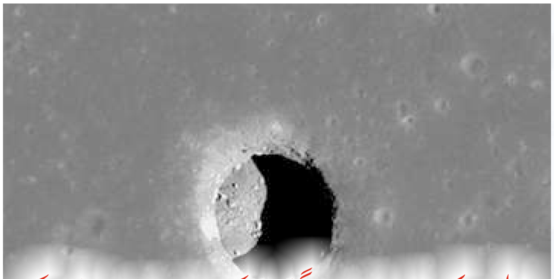

خیال ہے کہ چاند پر بہت سے گڑھے ایک دوسرے سے زمین کے نیچے موجود سرنگوں سے جڑے ہوئے ہیں جو شاید آتش فشاں پہاڑوں کے لاوا سے بنے ہیں۔تصویر: ناسا، بشکریہ دی گارجین ڈاٹ کام

ہیں اور موجود تحقیق سے ان غاروں کی حقیقت سامنے آنے لگی ہے۔لیکن ان غاروں میں پہنچنا سب سے بڑی دشواری ہے۔تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس غار کی تہہ تک پہنچنے کے لیے لگ بھگ 125 میٹر نیچے جانا ہوگا۔جس میں سب سے بڑی مشکل غار کے کنارے وہ ملبہ ہے جو ٹھوس نہیں ہے اور وہ کسی بھی انسانی حرکت سے گرسکتا ہے۔

بہر حال اس نئی دریافت سے کتنا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔لیکن سائنس دانوں کو یقین ہے اس دریافت سے چاند کی تاریخ اور زمین کے نظام شمسی یعنی سولرسسٹم کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوسکیں گی۔ تو بچو! امید ہے تم بھی بڑے ہوکر ایسے ہی کامیاب سائنس داں یا خلا باز بن کر اپنے خاندان اور ملک کا نام روشن کرو گے اور نئی نئی سائنسی تحقیق سے انسانیت کی خدمت کرو گے۔ ہیں نا!

بشکریہ: دی گارجین ڈاٹ کام

■

Idrees Shahjahanpuri (Idrees Ahmad Khan)
A-4, Phase -5, Aya Nagar Ext, New Delhi - 47
Mob.: 9711700720
iahmadk@gmail.com

نسیم سعید

منکی پاکس

(Monkeypox)

پیارے بچو! چار سال قبل ہم نے کورونا وائرس سے پھیلنے والی بیماری کووڈ-19 کے دور کو، اُس بیماری کے اثرات کو،اس کے علاج کے بارے میں بہت کچھ جانا اور سمجھا ہے۔ نپاہ وائرس، زیکا وائرس اور ڈینگو وائرس کے بارے میں بھی سنا ہے۔آیئے اب ہم موجودہ دور میں منکی پاکس وائرس سے پھیلنے والی وبا کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

منکی پاکس ایک وائرس ہے جو آرتھو پاکس وائرس (Orthopoxvirus)جینس کا ایک رکن ہے۔ اس کی وجہ سے منکی پاکس سنگین وائرل بیماری ہوتی ہے۔ یہ وائرس پہلی بار 1958 میں ایک تحقیق کے دوران دریافت ہوا، جب بندروں کی کالونیوں میں چیچک جیسی بیماری پھیلنے لگی۔اس بیماری کا پہلا انسانی معاملہ 1970 میں کانگو میں درج کیا گیا تھا۔ اس پیچیدہ بیماری کی دُنیا کے مختلف خطوں میں پھیلنے کی تاریخ موجود ہے۔ 2000 کی دہائی کے اوائل میں یہ وائرس افریقہ سے باہر پھیلنا شروع ہوا۔ 2003 میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ وبا بڑے پیمانے پر پھیلی۔ یہ پہلا موقع تھا جب مغربی نصف کرے میں منکی پاکس کی اطلاع ملی تھی۔ بین الاقوامی سطح پر دو سال قبل سال 2022-23 میں سماجی پھیلاؤ (Community Spread) کی علامات کے ساتھ نائیجریا کے باہر اس کے معاملوں کا پتہ چلا۔یعنی کووڈ۔19 کے دور میں جب دُنیا کی توجہ چیچک کے ٹیکے کی ایجاد سے ہٹی تو منکی پاکس نے اپنے لیے فوراً جگہ بنالی۔ موجودہ اعداد وشمار کے مطابق اکیلے افریقہ میں منکی پاکس کی قسم Clade-1 کے سترہ ہزار سے زیادہ معاملے سامنے آئے ہیں، جس میں سے 500 لوگوں کی موت واقع ہوگئی ہے۔سال 2024 میں اِس بیماری کا سب سے زیادہ اثر ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو

میں ہوا ہے۔عصر حاضر میں ہمارے پڑوسی ملک میں بھی اس وائرس نے دخل اندازی کرلی ہے۔لہٰذا یہ کہا نہیں جاسکتا کہ کب یہ ہمارے ملک میں بھی آجائے۔

شروعاتی دور میں انسانوں میں منکی پاکس وائرس کے اثرات وسطی اور مغربی افریقہ کے برساتی علاقوں تک محدود تھے۔ اُس وقت افریقہ کے علاوہ کانگو، نائیجیریا اور کیمرون جیسے ممالک بھی اس وبا سے متاثر ہوئے۔اس خطے میں گھنے جنگلات ہونے کی وجہ سے یہاں مختلف قسم کے جانور رہتے ہیں، جو وائرس کے لیے قدرتی میزبانی کا کام کرتے ہیں۔ جنگلات کی کٹائی اور اُن جنگلات میں بڑھتے ہوئے انسانی تجاوزات نے انسانوں اور جانوروں کے درمیان تعلقات پیدا کرنے میں آسانیاں فراہم کیں۔ اس کی وجہ سے منکی پاکس جیسی بیماری حیوانوں (Zoonotic) سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کے واقعات میں اضافے ہوئے ہیں۔

اس وبا کا پتہ درآمدشدہ افریقی چوہوں سے لگایا گیا تھا۔ان چوہوں نے پہلے کتوں کو متاثر کیا، اُس کے بعد یہ وائرس انسانوں میں منتقل ہوا۔تشخیصی سہولیات کی کمی اور صحت عامہ کی نگرانی کے محدود وسائل نے اس وائرس کے پھیلنے پر روک لگانے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلکہ اُن علاقوں کی ماحولیاتی اور سماجی واقتصادی صورتوں نے بھی دشواریاں پیدا کیں۔غیر ملکی جانوروں کی تجارت کی عالمی تنظیم نے اس وبا کو روکنے کے لیے سال 2003 میں سخت قوانین بنانے پر زور دیا ہے۔

پیارے بچو! اس وائرس کی بیماری کے پھیلاؤ کو قابو میں کرنے کے لیے اُس کی علامات، منتقلی اور احتیاطی تدابیر کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ وائرس بنیادی طور پر جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہوتا ہے۔ چوہے اور Primates، خون، جسمانی رطوبتوں یا متاثرہ جانوروں کی جلد اور بلغم کے علاوہ متاثرہ جانوروں سے براہ راست رابطے سے بھی یہ وائرس انسانوں میں آجاتا ہے۔

اس مرض کی ابتدا بخار سے ہوتی ہے۔ اس مرض میں عام طور سے مریض کو ایک خارش ہوتی ہے جو چہرے سے شروع ہوکر جسم کے دوسرے اعضا تک پھیل جاتی ہے۔خارش یا دھبے ہونے اور اُس کے گرنے کے کئی مراحل سے مریض گزرتا ہے۔اُس مرض کی علامات کی شدت مختلف ہوسکتی ہے۔کچھ انسانوں کو ہلکی بیماری کا سامنا کرنا ہوتا ہے تو کچھ مریض شدید تکالیف سے گزرتے ہیں۔

اگرچہ منکی پاکس کا کوئی خصوصی علاج نہیں ہے۔ معاون نگہداشت، اینٹی وائرل دواؤں، Vaccination اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرکے اس بیماری کو روک سکتے ہیں۔معالج اس کا علاج عموماً مرض ہونے کی تاریخ اور جسمانی معائنے سے شروع کرتا ہے۔خارش اور دھبے کے دانوں پر توجہ دی جاتی ہے۔جلد کے زخموں کے نمونوں کی Polymerase Chain reaction(PCR) جانچ ہوتی ہے۔ اس کے انفیکشن کی تصدیق کے لیے الیکٹرونی مائکرواسکوپی کا استعمال کیا جاتا ہے۔Vaccination اس بیماری سے حفاظت کا کارگر طریقہ ہے۔لیکن موجودہ ویکسین جانچ کے دائرے میں ہے۔سنگین صورتوں میں زیادہ سخت دیکھ بھال کے لیے اسپتالوں کا رُخ کرنا چاہیے۔ معاون نگہداشت میں مناسب ہائیڈریشن اور غذائیت کو

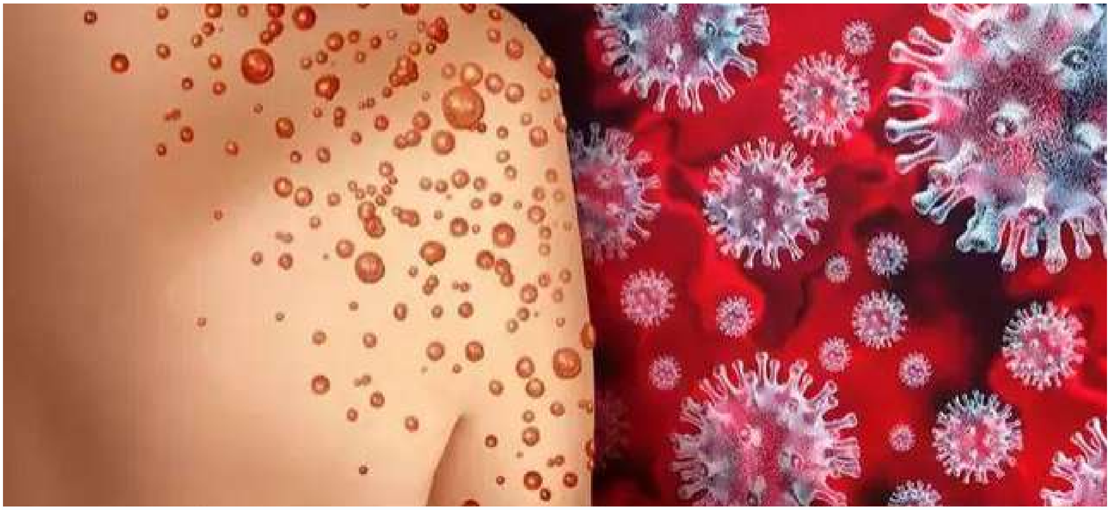

یقینی بنانا شامل ہے۔

منکی پاکس وائرس جس متعدی بیماری کے خاندان کا رُکن ہے، اس میں چیچک کے علاوہ Cowpox, Camelpox, Horsepox بھی شامل ہے۔منکی پاکس کی دوقسمیں Clade-1 اور Clade-2 ہیں ۔ پہلی قسم زیادہ خطرناک ہے۔لیکن اس کا دائرہ محدود مانا جاتا ہے۔ دوسری قسم دُنیا کے کئی علاقوں میں پھیل گئی ہے۔یہ جان لیوا بیماری تغیر پذیر ہے۔یہ چھونے،چھینکنے،کھانسنے اور ہوا میں مائعات کے ذرات سے بھی ایک انسان سے دوسرے انسان میں منتقل ہوسکتا ہے۔اسی خوف نے یہ ڈر پیدا کردیا ہے کہ ایک بار پھر سے عالمی تالابندی کا دور شروع نہ ہوجائے۔

عالمی صحت کی تنظیم (WHO) کے ڈائریکٹر جنرل نے مشرقی افریقہ میں منکی پاکس کے بالکل نئے پھیلاؤ کو ’عوامی صحت کی فکر کے لیے عالمی ایمرجنسی‘ کا اعلان کیا ہے۔موجودہ دور میں منکی پاکس کے علاوہ H5N1 برڈ فلو، ڈینگو بخار، چکن گنیا بھی مسلسل عالمی صحت کے لیے مسئلہ پیدا کررہے ہیں۔ عالمی حرارت اور آب وہوا میں لگاتار تبدیلی کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دُنیا کو مستقبل میں بھی نئی نئی وباؤں کا سامنا کرنا ہوگا۔

منکی پاکس کا نیا ویرینٹ Clade ib بہت ہی زیادہ خطرناک ہے۔اس مرض سے موت کا خطرہ دس سے گیارہ فی صد تک ہے۔یہی صورت دُنیا والوں کے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔اس وائرس کا اثر تین سے سترہ دنوں کے بعد ظاہر ہونے لگتا ہے۔انفیکشن کا اثر دیکھنے کے بعد مریض میں بخار، جلد میں خارش اور دھبے،نسوں میں سوجن، بدن میں اینٹھن ، سردرد، پیٹھ درد،سردی اور تھکان جیسی علامات نظر آنے لگتی ہیں۔جلد پر دھبے خاص طور پر منہ،ہاتھ اور پیروں میں دکھائی دیتے ہیں۔

کورونا کے دور میں ہم نے دہشت زدہ ماحول کا تجربہ کیا،مگر افسوس ہم نے کوئی درس حاصل نہیں کیا۔ہم اب بھی نئی بیماریوں کے انکشافات کو لے کر غفلت میں پڑے ہیں۔انسانوں کی بقا کے لیے ہمیں کمر کسنی ہوگی۔ٹیکوں کی ایجادات کو اولیت دینی ہوگی اور اُس کے لیے مالی تعاون

دینے میں دُنیا کے امیر وغریب ملکوں کو آگے آنا ہوگا۔

صحت عامہ کے اقدامات، احتیاطی تدابیر اور تحفظی کردار طبی، سائنسی، سماجی اور حفظانِ صحت کے اُصولوں کے تحت ہمیں منکی پاکس سے بچنے کے لیے درج ذیل نکات پر غور وفکر کرنا چاہیے۔

1. حکومتوں کو اپنے ملکوں میں ہائی الرٹ جاری کرنا چاہیے۔
2. اسپتالوں کو مریضوں کے لیے اضافی بستروں کا انتظام کرنا چاہیے۔
3. شعبۂ صحت کو ضروری اقداماتی منصوبوں کو نافذ کرنا چاہیے۔
4. عوام کو منکی پاکس سے بچنے کے لیے وقت بہ وقت دی گئی ہدایات پر سختی سے عمل کرنا چاہیے۔
5. ہوائی اڈوں اور عوامی مقامات پر بیماری کی جانچ کرنے کے انتظامات ہونے چاہیے۔
6. منکی پاکس سے متاثرہ انسان کو دوسروں سے الگ رکھنا ضروری ہے۔
7. متاثرہ انسان کے ساتھ قریبی رابطے میں رہنے والے انسانوں کی شناخت کرنا بھی ضروری ہے۔
8. عوام میں وائرس سے متعلق آگاہی مہم کا آغاز کرنا چاہیے۔
9. صحت کی نگرانی کی ترتیب میں سخت انفیکشن کنٹرول پروٹوکول پر عمل بجالانا چاہیے۔
10. ماسک، دستانے اور گاؤن وغیرہ ذاتی حفاظتی سامانوں کے استعمال کو ترجیح دیں۔
11. صحت کی نگہبانی کرنے والے کارکنوں کو ذاتی حفاظتی سامانوں کے صحیح استعمال پر تربیت دینے کے انتظامات کرنے اور حفاظتی پوشاک کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔
12. آئسولیشن روم اور وینٹیلیٹر کے انتظام پر دھیان دینا چاہیے۔
13. ہر عام وخاص کو صابن کا استعمال کر کے پانی سے باقاعدگی سے ہاتھ دھونا چاہیے۔ ہینڈ سینیٹائزر کا استعمال اور متاثرہ افراد کے قریبی رابطے سے گریز کرنا چاہیے۔
14. حکومتی سطح اور شعبۂ صحت کی جانب سے حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ہدایات بروقت جاری کردینا چاہیے۔ حفظان صحت کے فروغ کی مہمات کا انعقاد کرنا چاہیے۔
15. فعال اقدامات کے لیے سرکاری وغیر سرکاری تنظیموں اور سماجی صلاح کاروں کے مابین حفظان صحت کے اچھے طریقوں کو فروغ دینا چاہیے۔
16. بیماریوں کی مسلسل تحقیق اور ٹیکے کی ایجادات کو فروغ دینا چاہیے۔
17. درآمد شدہ جانوروں پر سخت نگرانی کرنے اور زونوٹک بیماری کی منتقلی کے امکانات کے بارے میں شعوری بیداری پیدا کرنا چاہیے۔
18. قدرتی ماحول کی حفاظت پر زور دینا چاہیے۔

■

Naseem Sayeed
M M Rabbani High School
Manappuram
Kamptee- 441002 (Maharashtra)
Mob.: 7798274366
sayeednaseem.2561970@gmail.com

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

—شیخ ابراہیم ذوق

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

—علامہ اقبال

جو دوست ہیں وہ مانگتے ہیں صلح کی دعا
دشمن یہ چاہتے ہیں کہ آپس میں جنگ ہو

—لالہ مادھو رام جوہر

سب کو پہنچا کے ان کی منزل پر
آپ رستے میں رہ گیا ہوں میں

—عبدالحمید عدم

ابتدا یہ تھی کہ میں تھا اور دعویٰ علم کا
انتہا یہ ہے کہ اس دعوے پہ شرمایا بہت

—جگن ناتھ آزاد

حد سے بڑھے جو علم تو ہے جہل دوستو
سب کچھ جو جانتے ہیں وہ کچھ جانتے نہیں

—خمار بارہ بنکوی

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

—مجروح سلطانپوری

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

—بشیر بدر

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

—افتخار عارف

پھولوں کو سرخی دینے میں
پتے پیلے ہو جاتے ہیں

—فہمی بدایونی

تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات

معلوماتِ عامہ بچوں کے کیریئر اور مستقبل سازی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جنرل نالج پوری دنیا سے جوڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اسی کے ذریعے مسابقہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں، اس لیے بچے اگر ابھی سے تاریخ، ادب وثقافت، سماج اور سائنس کے موضوعات اور معلومات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو مستقبل میں ان کے لیے راہیں آسان ہوجائیں گی۔

1. انٹرنیٹ کا موجد کون ہے؟
2. فیفا کا قیام کب عمل میں آیا؟
3. پہلا فیفا ورلڈ کب کس سال منعقد ہوا تھا؟
4. سورج کی روشنی سے کون سا وٹامن ملتا ہے؟
5. ٹائیگر کو کس چیز کی علامت سمجھا جاتا ہے؟
6. دنیا کا سب سے گہرا دریا کون سا ہے؟
7. دنیا کا گرم ترین سمندر کون سا ہے؟
8. انسانی جسم کی سب سے بڑی ہڈی کا نام کیا ہے؟
9. نیا قانون کس کا افسانہ ہے؟
10. دنیا کی سب سے اونچی عمارت کا نام بتائیں؟
11. ہندوستان کا سب سے پرانا اخبار کون سا ہے؟
12. دنیا کی پہلی خلاباز خاتون کا نام؟
13. دنیا کا سب سے ٹھنڈا علاقہ کون سا ہے؟
14. CD کا فل فارم کیا ہے؟
15. وہ کون سا پرندہ ہے جسے امن کا نشان کہا جاتا ہے؟
16. 2024 کا ٹی 20 ورلڈ کپ کس ٹیم نے جیتا؟
17. شیکسپیئر کا پوا نام کیا ہے؟
18. کھیت میں کون سی معدنیات کھاد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے؟
19. انگریزی میں شاعری کا موجد کون ہے؟
20. دنیا میں کتنے براعظم ہیں؟

(جواب صفحہ نمبر 44 پر ملاحظہ فرمائیں)

سمیہ کوثر محمد رفیق

کردار: شیر، ہاتھی، ہرن، چوہا۔

سیتاپور نام کا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں ایک جنگل تھا جس میں بہت سے جانور رہا کرتے تھے۔ روایت کے مطابق جنگل کا راجا شیر تھا اور اس کا دوست ہاتھی تھا۔

شیر اور ہاتھی دونوں جنگل کی سیر کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ موسم بڑا سہانا ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دونوں موسم کا لطف اٹھاتے ہوئے گھوم رہے ہیں کہ اچانک شیر کے دل میں ایک خیال آیا۔ وہ ہاتھی سے کہنے لگا:

شیر: میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہماری رعایا ہمارے بارے میں کیا سوچ رکھتی ہے۔

ہاتھی: بس اتنی سی بات ہے یہ تو میں ابھی بتا سکتا ہوں کہ آپ کی رعایا آپ کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے۔

شیر: تو پھر بتائیں کیسے خیالات رکھتی ہے؟

ہاتھی: سیدھی سی بات ہے، جیسے خیالات آپ ان کے بارے میں رکھیں گے۔ وہ بھی آپ کے بارے میں ویسے ہی خیالات رکھیں گے۔ یعنی

جیسی روح ویسے فرشتے' شیر کو یقین نہ آیا۔

شیر: کوئی کسی کے دل کی بات بھلا کیسے جان سکتا ہے۔

ھاتھی: آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ اپنے کانوں سے سن لیجیے۔

شیر: لیکن کیسے سنوں؟

ھاتھی: وہ دیکھیے ایک چوہا آرہا ہے مہربانی کرکے آپ ایک درخت کے پیچھے چھپ جائیں۔ شیر ایک موٹے اور بڑے پیڑ کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ اتنا چھوٹا چوہا اس کا دماغ بھی تو چھوٹا ہوگا۔ وہ کیا اچھے خیالات رکھے گا۔ وہ ہمارے بارے میں چھوٹی ہی سوچ رکھے گا۔ شیر اسی سوچ میں ڈوبا تھا کہ اتنے میں چوہا درخت کے قریب آ گیا۔

ھاتھی: چوہے کو پاس بلا کر کہنے لگا۔ کیا تمھیں پتا ہے ہمارے راجا شیر کا انتقال ہوگیا ہے؟

چوھا: خوشی سے ناچنے لگتا ہے اور کہتا ہے اچھا ہوا جو اس دنیا سے چلا گیا۔ بہت برا تھا ایسے راجا کا تو مرجانا ہی بہتر ہے۔ جسے اپنی رعایا کی فکر نہیں اچھا ہوا بہت ہی اچھا ہوا جو مرگیا۔ یہ سب کہہ کر چوہا خوشی سے ناچتے ہوئے چلا گیا۔

شیر نے جب یہ بات سنی تو اسے یقین نہیں آیا، اس نے ہاتھی سے کہا۔

شیر: یہ تو برائی کی بات ہوگئی۔ اگر اچھائی کے بارے میں بھی سن لوں تو تمھاری بات پر پوری طرح یقین ہوجائے گا۔

ھاتھی: ٹھیک ہے تھوڑی دیر رکیے، اُدھر سے ایک ہرن آرہا ہے اور وہ بہت کمزور بھی دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے بارے میں اچھا سوچے گا اور پھر اس کی باتیں سنیے گا۔ شیر پھر سے اس درخت کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

شیر: یہ ہرن تو کافی کمزور اور بیمار لگ رہا ہے۔ اس پر ترس آرہا ہے۔ میں اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا یا خدا اسے صحت وتندرست عطا کردے۔ شیر اسی خیال میں ڈوبا تھا کہ ہرن قریب آ گئی۔

ھاتھی: ارے ہرن سنو! کیا تم جانتی ہو کہ ہمارے راجا شیر اس دنیا سے چلے گئے۔ یہ سنتے ہی ہرن زور زور سے رونے لگا۔

ھرن: اے خدا! یہ کیا ہوگیا۔ ایسا رحمدل راجا ہمیں کہاں ملے گا۔ وہ اپنی رعایا کا کتنا خیال رکھتا تھا۔ اس کے بدلے مجھ بیمار کو اٹھا لیتا اور اسے سلامت رکھتا۔ ہرن روتے روتے چلا گیا۔

ہرن کی باتیں سن کر شیر نے ہاتھی سے کہا۔

شیر: ہاں! تم ٹھیک کہتے تھے۔ اب مجھے تمھاری باتوں پر ذرا سا بھی شک نہیں۔ سچ میں اگر تم کسی کے بارے میں جیسی سوچ رکھو گے، وہ بھی تمھارے بارے میں ویسی ہی سوچ رکھے گا۔

اس لیے بچو! ہمیں مثبت اور اچھی سوچ رکھنی چاہیے۔ اچھے خیالات کو اپنائیں تندرست رہیں۔

■

Sumayya Kausar Mohd Rafeeque
Fatmi Stor ki Gali, Ward No: 25
Lohar Mandi
Burhanpur - 450331 (MP)

علینہ فاطمہ معین خان، درجہ چہارم، ضلع پریشد اردو اسکول
پیپل گاؤں کالے، جلگاؤں جامود، ضلع بلڈھانہ، مہاراشٹر

ثوئیبہ اردم ضیاء الدین، ضلع پریشد اردو اسکول
پیپل گاؤں کالے، جلگاؤں جامود، ضلع بلڈھانہ، مہاراشٹر

محمد عمر عادل، سینٹ الفورس ہائی اسکول، بالا پور، چوراستہ میر پیٹ، حیدرآباد

مومنہ خاتون، درجہ سوم (ڈی)، الہدیٰ ماڈل اسکول، لکھنؤ، یوپی

بی بی خدیجہ ایاز پیرزادہ، درجہ پنجم، الہدیٰ اردو پرائمری اینڈ ہائی اسکول، وجے پور، کرناٹک

محمد نواز ابن نور محمد، جانٹس مکبدھر بندھ اسکول، برہانپور، مدھیہ پردیش

شاہ ارجمند محمد علی، درجہ ہشتم، زیڈ پی اردو اسکول، دھولے، مہاراشٹر

حذیفہ انعم شیخ محمد، درجہ پنجم، سید پورہ، بالا پور، ضلع، اکولہ، مہاراشٹر

ادیبہ بنت شاہد الاسلام، درجہ اول، جی ٹی پی ایس، شاہین باغ، دہلی

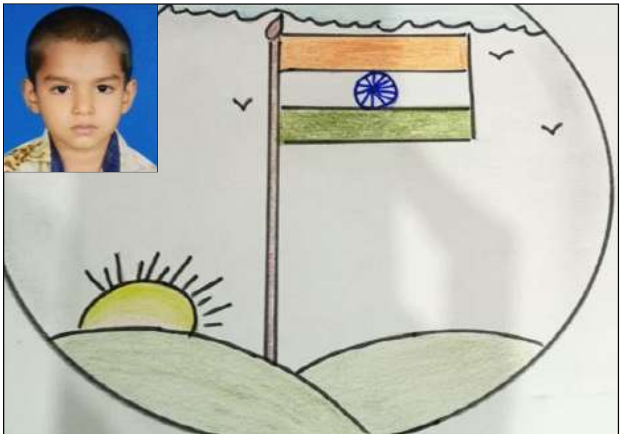

عمیر عبدالکریم خان، درجہ دوم، المنار پرائمری اینڈ ہائی اسکول، پوار بستی چکھلی، پونہ مہاراشٹر

عائشہ امان، درجہ دوم، اقصیٰ پبلک اسکول، نور چک، مدھوبنی، بہار

حفصہ عافیہ، درجہ چہارم، جی ڈی گوئنکا پبلک اسکول، سریتا وہار، نئی دہلی

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔
قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔
ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, अक्टूबर 2024, वर्ष 12, अंक 10
BACHON KI DUNIYA Monthly, October 2024 Vol. 12, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/09/2024
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

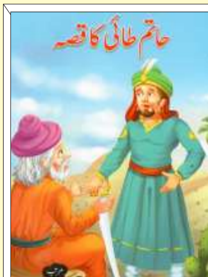

صفحات: 86 ، قیمت: 30 روپے

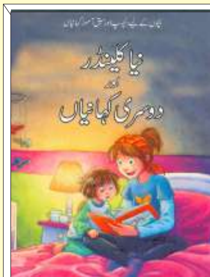

صفحات: 43 ، قیمت: 15 روپے

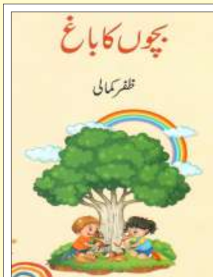

صفحات: 50 ، قیمت: 20 روپے

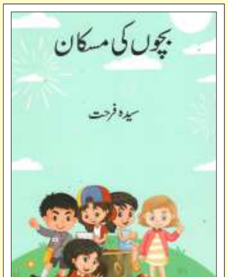

صفحات: 64 ، قیمت: 25 روپے

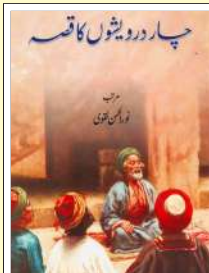

صفحات: 70، قیمت: 30 روپے

صفحات : 22، قیمت: 25 روپے

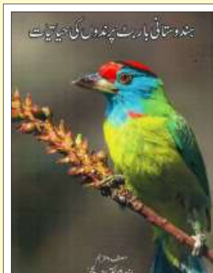
صفحات: 108، قیمت: 95 روپے

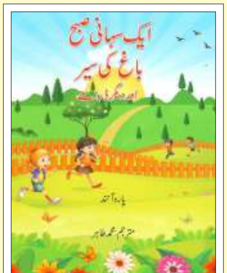

صفحات: 101، قیمت: 35 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6